اسلام کا فلسفۂ تاریخ

تاریخ کے حیاتیاتی اور مادی فلسفوں کی
تشریح و توضیح، انکی فکری لغزشوں کی نشاندہی
اور اسلامی فلسفہ کے ساتھ ان کا تقابل

تالیف

عبدالحمید صدیقی ایم، اے

مکتبہ چراغ راہ کراچی

ل ہرمزجی اسٹریٹ

بار اول — سنہ ۱۹۵۴ء

تعداد — ایک ہزار

بار دوم — سنہ ۱۹۶۹ء

تعداد — دو ہزار

اعلیٰ ایڈیشن

قیمت

دو روپے پچاس پیسے

سستا ایڈیشن

قیمت

ایک روپیہ پچھتر پیسے

سید کاظم علی نے ملت پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کر ... راہ لوسع

ر ل ہیرجی اسٹریٹ کراچی نمبر ۳ سے شائع کیا

فہرس

انتساب

" میں اپنی اس حقیر کوشش کو اپنے چھوٹے بھائی محمد مشتاق
مرحوم و مغفور کے نام معنون کرتا ہوں جس کی موت مادی تہذیب کی
آغوش میں پرورش پانے والے خود غرض انسان کے خلاف
ایک خاموش احتجاج تھی "

مُقدّمہ

جنوری ۱۹۴۹ء میں سلسبیل کی ایک خاص اشاعت میں میرا ایک مضمون "کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" شائع ہوا۔ بعض حضرات نے اس پر تنقید کرتے لکھا "یہ فطرت کے خلاف ہے۔ زمانہ ہمیشہ آگے کو بڑھتا ہے۔ پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا۔ لہٰذا ماضی کی طرف بلانے والوں کی آواز وحشت اور دیوانگی کی آواز ہے۔"

مجھے اس وقت اس امر کا پوری طرح احساس تھا کہ ان حضرات نے میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی پوری طرح کوشش نہیں کی، ورنہ اس قسم کی غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں کچھ عرصہ بعد ہمارے کالج کی بزمِ تاریخ کی ایک مجلس میں اسی موضوع کو کافی ردوبدل کے بعد پھر پیش کیا گیا۔

مقالہ کے اختتام پر جب بحث کا سلسلہ جاری ہوا تو اس میں مجھے دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اپنے نظریہ کی وضاحت کرنے کا پورا موقع ملا۔ معترضین میں

کئی قسم کے اصحاب شامل تھے.

ایک وہ جن کی غرض صرف اعتراض کرنا ہوتی ہے۔

دوسرے وہ جو مختلف قوموں کا الگ الگ اکائیوں (Units) کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی موت سے ان کے نظریات بھی مٹ جاتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ان کا خیال یہ ہے کہ نظریات بھی کسی خاص قوم کی میراث ہوتے ہیں۔

تیسرے وہ جو بجائے اقوام کے تہذیبوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر ہر تہذیب کو ایک فرد کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ وہ بھی انھیں منازل میں سے گزرتی ہیں جن میں سے عام انسان گزرتے ہیں۔

چوتھے وہ جو ہیگل اور مارکس کی پیروی میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ عرصہ تاریخ یا میدان دہر ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہے جہاں اضداد کے ظہور، تصادم اور امتزاج سے ہی انسانیت کا ارتقار ہو رہا ہے۔

مجھے اپنی اس بحث میں پہلی قسم کے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ دوسرے مدارس فکر کے نقطہ ہائے نظر کو میں وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں زیر بحث لاتا رہا اور اب انھیں کو ایک جا حاضر کر دیا ہے۔ پیش نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوع کے اظہار خیال پر مشتمل ہے مگر غور سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ نصب العین کی عینیت نے اسے ایک وحدت بنا دیا ہے۔ اس لئے اس کے قارئین اس میں ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب محسوس کریں گے

چند باتیں میرے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے ناموزوں نہ ہوں گی مجھے عقل کی حدود کا پورا پورا احساس ہے۔ میرے نزدیک انسان کے

واقعات جوں کے توں منعکس ہوں۔ وہ انفعالی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ شعوری طور پر مختلف عناصر و اجزا کے امتزاج سے فطرت کا تصور قائم کرتا ہے اور اپنے مقاصد کے تحت معروضی حقائق میں تصرف چاہتا ہے۔ اس میں اس کے ذاتی میلانات و رجحانات بھی شامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ انسان کی تمدنی زندگی کے متعلق کوئی صحیح اور متوازن لائحہ عمل پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ہم وحی کے محتاج ہیں۔ لہٰذا انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اسے اپنا راہبر بنا کر اپنی زندگی کا سفر جاری کرے۔

میری ان گزارشات سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں عقل کے کارآمد اور مفید ہونے کا سرے سے قائل ہی نہیں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ہم عقل کی حدود کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور اس کو ان کوچوں میں لے جا کر رسوا نہ کریں جن سے وہ قطعاً نا آشنا ہے۔ عقل کو اگر ایک منزل پر خود اپنی بے بسی کا اعتراف ہے تو اس سے اُس کے مدرکات پر کوئی حرف نہیں آتا۔

"عقل بلاشبہ ایک صحیح ترازو ہے۔ اس کے فیصلے یقینی ہیں۔ مگر اس ترازو میں امورِ توحید، امورِ آخرت، حقیقتِ نبوت، صفاتِ الٰہی اور وہ تمام امور جن کا تعلق انسانی اخلاق سے ہے تولے نہیں جا سکتے۔"

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے۔ اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوا جو ناممکن ہے۔ اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے۔ اسی طرح عقل کے عمل کا

بھی ایک دائرہ[۱] ہے جس سے باہر قدم نکالنا بہت بڑی حماقت ہے اس لئے تمدنی مسائل کے لئے ہمیں ناگزیر طور پر وحی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس وحی کی آخری اور مکمل ترین صورت ہمارے سامنے قرآن حکیم کی شکل میں موجود ہے۔ اس کے سارے مضمرات کو خداوند تعالیٰ کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (فدا ہوں ہمارے ماں باپ ان پر) نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ہمیں پوری طرح سمجھا دیا ہے۔ اب اس فکر سے ہٹ کر جو فکر بھی ہوگا وہ انسان کو ہلاکت وتباہی کی طرف لے جائے گا۔

پیش نظر مجموعہ میں فلسفۂ تاریخ کے متعلق عقل کے پرستاروں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں ان کا ایک سرسری سا جائزہ لے کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کا اس بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے۔

جو لوگ تہذیبوں اور قوموں کو انسانوں کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے ان کے فنا اور بقا کے اصول بھی انھیں کے مطابق مرتب کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی حیات و ممات کے قوانین طبعی کی پابند نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا سب سے بڑا محرک ایک ارادہ ہے اور ایک ارادہ یا فکر ایک ایسی قوت ہے جس سے بعض اوقات دھارے کا رُخ بالکل بدل جاتا ہے۔ ایک نہیں تاریخ کے بیشمار واقعات ایسے دیکھنے میں آئے ہیں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کی قوتِ فکر وعمل نے تاریخ کے رُخ کو بالکل ایک دوسری سمت میں پھیر دیا۔ مورخین ان واقعات کے گزر جانے کے بعد اپنے انداز فکر کے مطابق ان کی کوئی نہ کوئی توجیہ

---

[۱] علامہ ابن خلدون

کرتے ہیں۔ مگر جرات مند افراد کا عزم اپنا راستہ خود بناتا ہے اور تاریخ والوں کے متعین راستوں کا پابند نہیں ہوتا۔

خودی
پھر اس طرز فکر نے انسانیت کے مستقبل کو سراسر تاریک بنا دیا ہے جو فلسفہ انسانی ایغو کے عمل تخلیق کی توجیہہ زمان و مکان کے ذریعہ سے کرے۔ وہ انسان کو کائنات کے قواعد و حدود تو بتا سکتا ہے مگر اس کی زنجیروں سے انسان کو نجات نہیں دلا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں انتہائی مایوس ہے۔ مشہور اطالوی مفکر کروشے (Croce) نے اسی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے۔

" انسانیت پر کئی بار یاسیت کی پرچھائیں پڑی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ انسانی میں بے شمار ادوار ایسے بھی آئے ہیں جب انسان شک اور مایوسی کا شکار رہا۔ مگر دور جدید میں یہ سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ فلاسفر یا وہ لوگ جن کی نگاہیں دور رس ہوتی ہیں وہ فلسفیانہ اور تاریخی حقائق کی بنا پر پیشگوئی کر رہے ہیں کہ انسانیت کا قافلہ نہایت ہی خطرناک اور مہیب غار دل کی طرف جا رہا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں اس کائنات میں صرف ایسی قوتیں ہی کار فرما ہیں جو تمام تر خارج میں واقع ہیں۔ اور ایک لگے بندھے قانون کے مطابق مصروف عمل ہیں ان قوتوں کے مقابلے میں ہم اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتے ہیں ہمارے لئے امید کی اگر کوئی جھلک ہے تو صرف یہی

کہ ہم خارجی دنیا میں ایسی قوتوں کا کھوج لگائیں جو یا تو بالکل مخالف سمت میں اپنا عمل جاری رکھیں یا ان کو شکست دیں یا ان کی کارفرمائی کو کسی طرح روک دیں۔ مگر یہ خیال خام ہے۔ کیونکہ اس میں بھی ہمارا سارا انحصار خارجی قوتوں پر ہے "

اسی طرح ہیگل مارکس کے افکار نے انسانیت کے اچھے احساسات پاکیزہ جذبات اور اخلاقی اقدار کو بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے کیونکہ جس اساس پر ان نظریات کی تعمیر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانیت کا ارتقا باہمی کشمکش کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لئے انسان میں تعاون کے احساسات ابھرنے کے بجائے مخاصمت اور حسد کے جذبات بھڑکنے چاہئیں۔ ان سے انسان نے جو سبق حاصل کیا وہ یہ ہے کہ اگر اسے دنیا میں پھلنا پھولنا ہے تو اسے اپنا سب کچھ اس کشمکش میں جھونک دینا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان انتہائی بے رحم اور سنگدل ہو گیا ہے۔ آج اگر کوئی قوی کسی کمزور کو پامال کر کے آگے بڑھتا ہے تو وہ عین فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ جینے کا حق صرف اسی کو ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ظلم سہتا ہے اور قوت کے پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے تو وہ اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اس نظریہ نے نہ صرف انسان کو جابر اور ظالم بنا دیا ہے۔ بلکہ ہر صاحب قوت کو برحق ثابت کر کے اس نے سرمایہ داری اور استعماریت کے لئے عقلی زمین بھی فراہم کر دی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے شر سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ ان نظریات نے اسے سراسر

خیر بنا دیا ہے۔

پھر ان تصورات نے لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو راسخ کر دیا ہے کہ ہر قسم کی حرکت بشرطیکہ وہ کامیاب ہو انسانی ارتقا کی ضمانت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے حق اور انصاف کے بجائے قوت اور طاقت کی پرستش شروع کی۔ اس نے اپنی طباعی کو ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف کیا ہے جس سے اس کی قوت اور طاقت میں اضافہ ہو۔ دور جدید کی جارحانہ ملوکیت اور ظالمانہ امپریلزم اسی تصور کے شاخسانے ہیں۔

اس کے علاوہ اس طرز خیال نے لوگوں کو مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار سکھایا۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے بقا و استحکام اور حصول قوت و اقتدار کے لئے کوشاں رہے۔ چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ اگر یہ مقصد مذہب و اخلاق کی پیروی سے حاصل ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے۔ مگر اس کے برعکس اگر کامیابی ان کو ترک کرنے سے حاصل ہو تو انھیں فی الفور نظر انداز کر دینا چاہئیے۔ پچھلی چار صدیوں میں باطل پرست فلانستا دی حکیم میکیاولی کی تعلیم کو جو قبول عام نصیب ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔

آغاز میں اہل یورپ ان نظریات کے بارے میں بڑی خوش فہمیوں میں گرفتار تھے مگر جب یہ تصورات آشنائے تعبیر ہوئے تب انھیں ان کی لغزشوں کا صحیح طور پر احساس ہوا۔ آج مغربی تہذیب کی آغوش میں پلے ہوئے ایک نہیں بیسیوں مفکرین ایسے ہیں جنہوں نے ان نظریات

کی ناکامی کا نہایت ہی واضح طور پر اعتراف کیا ہے۔ یہاں ہم صرف دو اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ یہ الفاظ کسی عام انسان کے نہیں بلکہ یورپ کی دو اُن غیر معمولی ذہین اور مقبول شخصیتوں کے ہیں۔ جن کے فکر کی گہرائی کے دوست اور دشمن دونوں معترف ہیں۔ ان سے یورپین فکر کی ناکامی کا ایک دھندلا سا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

۔ بدیہی شہادتوں کے پیشِ نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ ہماری تنظیم، ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گزر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے بدن میں ناسور ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جس کے ایک طرف ماضی کا حسّی تمدن ہے اور دوسری طرف مستقبل کا تصوری تمدن۔ ہم چھ سو سال گزارنے کے بعد زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی بھولی بھٹکی کرنیں اگرچہ دنیا کو منور کر رہی ہیں مگر رات کے تاریک سائے بھی ہر لحہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ شفق کی اس مدھم سی روشنی میں جب کہ سورج کی روشنی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ ہمارے لئے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ تاریک رات نوعِ انسانی کو اپنے ڈراؤنے پردوں میں چھپانے کے لئے منتظر ہے۔

(پ۔۱۔ سارد کن)

اسی طرح ایک دوسرے بلند پایہ مفکر کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیے!

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤ یہاں تک بڑھا دیا ہے کہ اس کا بنک اکاؤنٹ اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے جا چکے ہیں۔ تعطل بڑا خطرناک ہو رہا ہے۔ وہ ہر لمحہ یہی سوچتا ہے کہ اب جیتا۔ مگر اسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر ہرگز بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے بل پر اس کی کامیابی یقینی ہو۔ وہ علمائے اجتماعیات اور معالجین نفسیات سے دریافت کرتا ہے "تم ہمیں ایک صالح معاشرہ کب بہم پہنچاؤ گے۔ کیا ہمیں تباہی سے بچانے کے لئے اس کا بروقت انتظام ہو جائے گا۔ پھر جب وہ اسے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے تو مجھ ایسے تاریخ دانوں سے سوال کرتا ہے "جس نوعیت کی الجھن میں انسانیت آج گرفتار ہے اس کے پیش نظر آخر تاریخ دنیا کا انجام کیا ہوگا؟ کیا واقعی انسانیت کبھی پہلے بھی ایسی مصیبت میں پھنسی ہے جس میں آج مبتلا ہے" ہاں! بارہا! جدید علم حرفت کی وجہ سے اگر ہم کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں تو واقعہ یہی ہے۔ انسانوں نے پچھلی صدیوں میں اسی طرح "تاش کے پتے" اپنے ہاتھ میں لے کر قماربازی کی ہے۔ جو ہم سے مختلف نہ تھی۔ مگر گزشتہ زمانوں میں داؤں اس قدر بھاری نہ تھے۔

(آرنلڈ ٹائن بی)

Toynbee

یہ دو اقتباسات ہی حالات کی نزاکت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔ دنیا اس وقت جس کرب و بلا میں مبتلا ہے اُس کا صحیح اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے پچھلی نصف صدی کے واقعات کا کسی قدر گہرا مطالعہ کیا ہے۔
نوع انسانی اس وقت ایک ایسے نظام کی متلاشی ہے۔ جو اگر ایک طرف افراد کے فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلاست، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی اور برتاؤ میں خوش گواری پیدا کرتا ہو تو دوسری طرف معاشرت میں حسن سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن معیشت میں عدل و مواساۃ، سیاست میں دیانت، جنگ میں شرافت، صلح میں خلوص اور عہد و پیمان میں وثوق پیدا کرے، ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام زندگی سوائے اسلام کے اور کہاں مل سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ جو قوم اس کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتی ہے وہ غفلت کا شکار ہے۔ اسے اپنے عالی مقام اور نازک ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں رہا۔
یہ قاعدے کی بات ہے کہ نظریات خواہ کتنے ہی دل کش اور صحیح ہوں مگر ان کی افادیت اس وقت تک مشتبہ رہتی ہے جب تک کہ انسانوں کا کوئی گروہ عمل کی دنیا میں ان کی صداقت اور برتری ثابت نہ کر دے۔ کیونکہ انسانی جدوجہد کی اصل غایت یہ ہے کہ اس کی حیات شاندار، مؤثر اور رافز دل ہو جائے لہٰذا کسی تہذیب و تمدن کی کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ نظریات کے شیش محل کھڑے کر دے بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کو صبر و سکون کی نعمت سے مالا مال کر دے اور پوری انسانیت کو تاریکی اور درندگی سے نکال کر اس مقام پر لے آئے

جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنا سفرِ حیات جاری رکھ سکے۔ لہٰذا اگر کوئی گروہ نہایت ہی اخلاص سے یہ سمجھتا ہے کہ انسانیت کی فلاح اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے تو اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کرنا چاہیئے۔ قرطاس میں محفوظ سچائیاں کبھی سودمند نہیں ہو سکتیں جب تک انھیں عملی طور پر صحیح ثابت نہ کر دیا جائے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں پر ایک عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ خدا اور خلق دونوں کے سامنے جوابدہ ہیں۔ آج دم توڑتی ہوئی مخلوق اور خداوند تعالےٰ کے فرشتے دونوں ہی دیکھ رہے ہیں کہ یہ "خیر الامم" کس طرح اور کس حد تک اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔

یہاں بے جا نہ ہوگا کہ اگر میں چند ضروری باتیں اسلام کے فلسفۂ تاریخ کے متعلق بھی عرض کر دوں :-

اسلام کا نقطۂ نظر جس طرح دوسرے معاملات میں نہایت وسیع ہے اس طرح فلسفہ تاریخ کے بارے میں بھی اس میں بے حد وسعت ہے وہ زمان و مکان کی پابندیوں سے یکسر آزاد ہو کر کسی ایک گروہ کا نہیں۔ بلکہ پوری انسانیت کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے ہاں نہ تو جغرافیائی ماحول کو بہت زیادہ دخل ہے نہ نسلی خصوصیات کو۔ وہ پوری انسانی تاریخ کو حق و باطل کی باہمی آویزش کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اہل حق خواہ کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، کسی ملک کے بسنے والے ہوں۔ کسی زمانہ میں رہنے والے ہوں — سب ایک ہیں۔ اسی طرح باطل پرست خواہ وہ ہزار سال پہلے کے ہوں یا دورِ جدید

کی پیداوار، سب ایک ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے قوموں کے عروج و زوال کا ذکر اس بلیغانہ انداز سے کیا ہے کہ ازل و ابد کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور فردا اور دی کا تفرقہ بالکل مٹ گیا ہے۔ اقبالؔ نے غالباً اسی نقطۂ نظر کی تائید میں کہا ہے

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم!

قرآنِ حکیم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات علم حکمت کے اس قدر بڑے خزانے ہیں کہ کوئی شخص یا انسانوں کا کوئی گروہ ان کی وسعت کا صحیح طور پر احاطہ نہیں کرسکتا پھر مجھ ایسا انسان جس کا علم بالکل محدود ہو اور فکر نارسا، وہ کس طرح یہ دعوےٰ کرسکتا ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ میں یہ بات محض انکسار کے طور پر نہیں بلکہ اعتراف حقیقت کے طور پر عرض کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی کمزوری، اپنی بے چارگی اور اپنی بے مائیگی کا پوری طرح احساس ہے۔ میں نے اس بحث کو شروع کرنے کی صرف اس لئے جرأت کی ہے تاکہ یہ موضوع دوسروں کے لئے غور و فکر کا محرک بن سکے۔

ان مضامین کی اشاعت سے نہ تو حصول شہرت مقصود ہے نہ ہی جلب منفعت۔ صرف ایک جذبہ نے اس طرف مائل کیا اور وہ یہ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس پیغام ہدایت کو لے کر آئے تھے اس کی صداقت کا نقش دلوں پر ثبت ہو۔

ان مضامین کے لکھنے میں میں نے بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا

اس کے لئے میں ان تمام مصنفین کا شکر گزار ہوں۔ ان کی فہرست آخر میں درج کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں کئی اہل علم حضرات سے بھی وقتاً فوقتاً راہنمائی حاصل کرتا رہا۔ میں ان سارے بزرگوں کا اس قدر ممنون ہوں کہ اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ کاش وہ میرے دل کے دریچوں سے جھانک سکتے۔

یہ مضامین ابھی ادھورے ہی تھے کہ میری ملاقات جناب خالد احمد صدیقی ازرحم سے ہوئی۔ موصوف نے جس خلوص اور شفقت سے مجھے ان مضامین کو یکجا کرنے کی ترغیب دی اور بعض اوقات ترہیب کی اس کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی احسان فراموشی ہے۔

عبدالحمید

۱۲ نومبر ۱۹۵۳ء
اقبال گنج۔ گوجرانوالہ

عبدالحمید

تاریخ کا حیاتیاتی نظریّہ

نہ معلوم علمی حلقوں میں یہ سوال کتنی بار دہرایا گیا ہے کہ ایک تمدن جو مٹ چکا ہو کیا اس کے اِحیا کی بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ شپنگلر اور اس کے ساتھی تمدّن کو ایک فرد کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک انسان کی زندگی کی طرح طفولیت، جوانی اور بڑھاپے کے ادوار میں سے گزر کر موت کی آغوش میں جا گرتا ہے ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے:

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایک تمدن جنم لیتا ہے اور کچھ مدت کے بعد عہد طفولیت میں قدم رکھتا ہے۔ اس دور میں اس کے علم برداروں میں انتہائی جوش و خروش دکھائی دیتا ہے۔ ساری کی ساری کائنات اور اس کے آغوش میں جتنے بھی واقعات ملتے ہیں۔ اُن میں اس کے متبعین ایک مقصدی ترتیب اور ارادی ربط دیکھتے ہیں۔

افراد اور ان کے عمل و تنظر کے زاویوں کی قریب قریب ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ اس عہد کی حکومت کی بنیادیں نہایت ہی محکم اور مستحکم نظر آتی ہیں اور خیالات اور دل و دماغ کی وسعت کے ساتھ ساتھ سلطنت کی وسعت کا افق بھی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ان کا آرٹ ابتدائی اور ناتراشیدہ ہونے کے باوجود قوت بخش ہوتا ہے۔ اور سفر کے اسی راستہ پر گامزن ہو کر تمدّن دور شباب میں داخل ہوتا ہے۔

یہ دوسرا دور علم و ادب کا زرّیں زمانہ کہلاتا ہے۔ خدا پر ایمان واضح اور گہرا ہونے کی وجہ سے افراد کے دل و دماغ کے ہر ریشہ میں سرایت کرتا ہے۔ اس ماحول میں سانس لینے والے انسان خدا کو انسانی شکل دینے کے جذبے کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ کائنات اور اس کے مختلف مشاہدات میں اب بھی ایک ربط محسوس کیا جاتا ہے۔ حکومت کیلئے دلوں میں انتہائی پاس داری موجود ہوتی ہے۔ سماج کا اعلیٰ طبقہ پر شوکت اور شائستہ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ عہد اپنے آپ کو پانچویں صدی قبل مسیح کے ایتھنز قیصر آگسٹس کے روما ورا ٹھارویں صدی کے فرانس میں جلوہ گر پاتا ہے۔

ترقی کے یہ سارے منازل طے کر چکنے کے بعد پھر انحطاط شروع ہو جاتا ہے علم و ادب کے سارے چشمے خود بخود سوکھ جاتے ہیں سبزی دور نقرئی دور میں بدل جاتا ہے۔ چالاکی اور عیاری قوم کی تخلیقی قوتوں کی جگہ لے لیتی ہے حکومتیں جمہوریت کا مظہر اتم ہوتی ہیں۔ آمریت کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں اور اپنی قوت کے پرزوں کی سونے اور چاندی کے پانی سے آبیاری کرنے لگتی ہیں۔ خداوند عالم

خدا وند عالم سے جس قدر رشتے ہوتے ہیں بالکل ٹوٹ جاتے ہیں۔ کائنات میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ پردۂ غیب میں منہ چھپا لیتی ہے۔ انسانی زندگی بلند تر مقاصد سے گر کر عیش پسندی کے معیار پر گھومنا شروع کر دیتی ہے اور کسی بیرونی دشمن کے ایک ہی بھرپور حملے سے تمدّن کی یہ عمارت پیوند خاک ہو جاتی ہے

اس مدرسۂ فکر کے خیال میں سب تمدنوں کے ساتھ تقریباً یہی معاملہ ہوا مصر کے مقبروں سے "سریانی تہذیب پیدا ہوئی" پھر اسے بھی زوال ہوا۔ یونان کے فکری کھنڈرات سے روم کا عظیم الشان قانون ابھرا۔ پھر اس پر بھی موت طاری ہو گئی۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں قومیں مختلف تمدنوں کی علمبردارین کر اس دنیا کے سٹیج پر ابھریں تاریخ کے صفحات نے ان کا خیر مقدم کیا، وہ بڑھیں اور ان کے افکار و نظریات پھلے پھولے، انہوں نے طاقت کو غلام بنایا اور دنیا پر چھا گئیں پھر جب موت کی ساعت آئی تو ہمیشہ کیلئے سو گئیں۔ بچاؤ کے سارے حیلے پھر اس تنزل کو باز نہیں رکھ سکے کیونکہ یہ انکی اجل تھی اور جب اجل آ جائے تو ٹل نہیں سکتی۔ تاریخ کے اوراق ہی پھر انکے مدفن بھی بنے۔ اب ان گزری ہوئی اقوام کی جامد روایات باقی ہیں۔ ایک تن جس سے جان نکل چکی ہو۔ اس کے لئے بقراط و جالینوس کی حکمت بھی چارہ گر نہیں ہو سکتی۔ بالکل اسی طرح ایک تمدّن جو مٹ چکا ہے، اس کے لئے احیا کی جدوجہد بالکل بے سود ہے اور اس سلسلہ کی تمام کوششیں ناکام و نامراد ثابت ہوں گی۔

یہ ہے تمدّن کے متعلق وہ نظریہ جو شپنگلر نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوال مغرب"[1] میں پیش کیا ہے تمدّن سے متعلق اس کے نظریہ

[1] DECLINE OF THE WEST BY OSWAID SPENGLER.

کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تمدن سے اس کی مراد اخلاقی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی قوانین کی ظاہری اور خارجی نمود ہے۔ جو کسی قوم کی زندگی میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمدن کا بڑا ہی سطحی تصور ہے۔ تمدن محض ان سطحی، خارجی اور محسوس شعائر کا مجموعہ نہیں ہے جو ایک قوم کے باشندوں میں دیکھے جاتے ہیں بلکہ ہر قسم کے تمدن کی اصل جڑ انسانی ذہن میں لگی ہوتی ہے جس سے ظاہری واقعات کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ تمدن کی اس جڑ کا نام تہذیب ہے جو دراصل عبارت ہے اس خاص ذہنی میلان یا اندازِ فکر سے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ وہ کسی قوم کا ایک مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے۔ جس کی بنا پر اس کے بیشتر افراد عام حالات میں ایک مخصوص طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یورپ کی موجودہ اقوام اور یونان و روما کی گزری ہوئی قوموں کے تمام تمدنی اختلافات کے باوجود ہم ان میں ایک ہی تہذیب کارفرما پائیں گے۔ کیونکہ جن فکری اور اخلاقی عناصر سے ان کی سرشت کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ وہ سب میں یکساں و مشترک ہیں۔ گزری ہوئی قوموں کو تو فی الحال نظر انداز کیجئے۔ موجودہ دور کی انگریزی امریکی، جرمن فرانسیسی اقوام پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اساسی مسائل ایک جیسے ہیں اور ان کے حل کرنے کے طریق اگر ظاہر میں نہیں تو کم از کم اپنی اخلاقی و ذہنی روح کے اعتبار سے ایک

تہذیب

دوسرے سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان سب ممالک میں ایک فرد کے ساتھ دوسرے فرد کے تعلقات کو سرمایہ اور محنت کے روابط کو سماج اور فرد کے رشتے کو ایک ہی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان میں اس قدر مماثلت اور یگانگت کیوں دکھائی دیتی ہے؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان سب ممالک کے باشندوں کے ذہنوں پر مادہ پرستی سوار ہے اور فکر و عمل کے سارے دھارے اسی مادہ پرستی کے چشمہ سے ابلتے ہیں۔ اور مادہ پرستانہ ذہنیت صرف معاشی میدان میں ہی نظر نہیں آتی بلکہ ان کی زندگی کے خالص مذہبی اور اخلاقی خانے بھی اسی کی رنگینیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس میں یہ ذہنیت اپنے آپ کو پوری آب و تاب سے منعکس نہ کرے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ تمدن ایک مربوط نظام فکر و عمل ہوتا ہے۔ جس کے مختلف شعبوں میں مشترک روح تہذیب کی وجہ سے پوری ہم رنگی و یگانگت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید تمدن کا تجزیہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ جس اساس پر اس کی سر بفلک عمارت اٹھائی گئی ہے۔ وہ محسوس پرستی الحاد اور مادہ پرستی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمدن بنتے اور بگڑتے رہے مگر ایک ہی روح تہذیب بار بار مختلف قوموں کے تمدن میں ظہور کرتی رہی۔ جب چین کی پرانی تہذیب کو زوال آیا تو اسی بنیاد پر یونانی تہذیب نے جنم لیا اور جب یونانی اور رومی تہذیب بھی اپنے متبعین کی باہمی منافرت اور جنگ و جدل کی وجہ سے مٹنے لگی تو پھر مشرق بعید میں

ویسی ہی تہذیب اگلے دو تین سو سالوں میں معرض وجود میں آگئی [1]

آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر ایک ہی تہذیب مختلف قوموں کے تمدن میں بار بار جلوہ گر ہوتی ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ جو قوم بھی کسی نظریۂ حیات کو اپنا کر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیتی ہے اس قوم کے افراد میں اسی کے مزاج سے مناسبت رکھنے والے سیرت و کردار نمودار ہوتے ہیں "جب ایک قوم کے افراد عادتاً ایک ہی طرح کے عمل کرتے ہیں تو یہ اس قوم کا تمدن کہلاتا ہے اور وہ ذہنی ساخت جس کی وجہ سے اس قسم کے عمل ظہور میں آتے ہیں وہ اس کی بنیادی تہذیب ہے تمدن در حقیقت تہذیب کا ایک خاص جغرافیائی ماحول میں محسوس عملی ظہور ہے۔ زمان و مکان کے اختلافات ممکن ہے۔ دو تمدنوں کی ظاہری شکلوں میں جن کی اساس ایک ہو، بڑا نمایاں فرق پیدا کر دیں۔ لیکن ان کے حاملین کا اگر تہذیبی نقطۂ نظر ایک ہے تو ان کے تمدن کی مختلف شکلوں میں بھی بہت حد تک بنیادی مماثلت اور یگانگت دکھائی دے گی۔ اگر ہم تمام دنیا کے تمدنوں کو خدا شناسی اور خدا ناشناسی کے اعتبار سے تقسیم کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک قسم کے تمدن چاہے مختلف ادوار میں کتنے ہی مختلف ناموں سے پکارے گئے ہوں مگر روح کے لحاظ سے وہ ایک ہی طرح کے رہے۔ انسانی فطرت میں کوئی اساسی فرق واقع نہیں ہوا۔ وہ جوں کی توں ہے۔ خارجی مسکن بدل جانے سے کوئی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ زندگی کے مادی کارخانہ

[1] Civilization on Trial by A. J. Toynbee. P. 219

میں تخریب وتعمیر کا جو ہنگامہ برپا ہے، بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، زوال وکمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہ محدود سے محدود اور وسیع سے وسیع میدانوں میں ایک ہی شہادت فراہم کرتا ہے۔ یہ کہ اس ظاہری پردۂ فلم پر انسانی فطرت اور اس کے شعوری خصوصیات اور غیر شعوری جذبات و ہیجانات چھپے چھپے عکاسی کر رہے ہیں اور انجان یہ جانتا ہے کہ اس پردے پر کوئی تغیر واقع ہو رہا ہے۔ انسانی عمل کے سارے کے سارے محرکات، محبت، شہوت، بھوک، کبریائی کی دُھن جذبہ خدمت، سماج کی پاس داری، ذوق خدا پرستی، ہر عہد میں برسر عمل رہے ہیں۔ چاہے ان کے اشکال پرچھائیوں میں کتنا ہی سمٹاؤ اور کتنا ہی پھیلاؤ کیوں نہ ہو مگر ان محرکات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ جو نیکی یا بدی اس کرہ ارضی پر ایک دفعہ عمل میں آ چکی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دہراتی چلی آ رہی ہے اور نہ معلوم یہ ٹھیک ہے کہ نیکی اور بدی بار بار ابھرتی اور دبتی ہے۔ مگر یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے اسٹیج پر رونما ہوتا ہے۔ اور سطح بیں آنکھیں یہ گمان کرنے لگتی ہیں کہ یہ کوئی نیا کھیل ہے جو کھیلا جانے لگا ہے جس کا کوئی تعلق بھی گزرے ہوئے زمانوں سے نہیں دراصل یہ زندگی کی حقیقت سے سخت ناانصافی ہے۔ جنگ وجدال اور گروہ بندی، جب سے دنیا قائم ہے، موجود ہے اور اسے دنیا سے بالکل مٹایا نہیں جا سکا مثال کے طور پر امریکہ کی خانہ جنگی نوعیت کے اعتبار سے کوئی بے مثال واقعہ نہیں اس سے ملتے جلتے ہزاروں واقعات تاریخ عالم میں رونما ہو چکے

ہیں جن واقعات کا امریکہ کی خانہ جنگی میں ظہور ہوا وہی بسمارک کی جنگوں میں جرمنی کی سرزمین میں سنہ ۱۸۶۴ تا ۱۸۷۱ء کے درمیان دہرائے گئے۔ دونوں ملکوں میں نامکمل سیاسی اتحاد ہی خطرے کا باعث بنا، دونوں ممالک میں اس اتحاد کا شیرازہ بکھرنے اور پھر اس اتحاد کے دوبارہ قائم ہونے کا آخری فیصلہ قاضی شمشیر نے کیا دونوں میں اتحاد کے حامیوں کی جیت ہوئی اور فتح کی وجہ ان کی فنی اور صنعتی برتری تھی۔ پھر دونوں ممالک میں فتح کا نتیجہ ملک میں صنعتی ترقی تھا۔ جس نے دونوں قوموں کو انگلستان کا تجارتی میدان میں رقیب بنا دیا۔

واقعات کی اس تکرار کی مثال انگلستان کا صنعتی انقلاب ہے۔ آغاز کے وقت یہ بالکل اپنی مثال آپ تھا۔ مگر سنہ ۱۸۷۰ء کے بعد بہت سی یورپین اور غیر یورپین قومیں انقلاب کے اسی چکر میں سے گزریں۔ جو جو فوائد اور مصائب انگلستان کو پیش آئے تھے۔ وہ انھیں بھی پیش آئے۔ انقلاب کی مضرتیں اور سہولتیں سب کی سب انھیں بھی نصیب ہوئیں۔

آپ اگر صنعتی دائرہ سے نکل کر سیاسی میدان میں بھی دیکھیں گے تو وہاں بھی آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور جرمنی کی تہذیب کینیڈا میں دہرائی جا رہی ہے۔ عہد جدید میں ہی دیکھیں گے۔ کتنے وفاقی اتحاد قائم ہوئے ہیں اور پھر ان میں کتنے صنعتی انقلابات آئے ہیں جنعتی انقلاب کا ڈرامہ پہلے انگلستان میں کھیلا گیا۔ پھر اسی کا اعادہ امریکہ اور جرمنی میں ہوا۔ اسی طرح فیڈرل یونین کا قیام پہلے

امریکہ میں ہوا اور اب آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور برازیل میں اس کا ظہور ہوا ہے۔[۱]

ممکن ہے کہ ان سب ممالک میں جہاں ان واقعات کو دہرایا گیا ہے ان کے جغرافیائی حالات کی وجہ سے واقعات میں کسی حد تک کوئی فرق آگیا ہو۔ مگر وہ فرق ظاہری ہوگا۔ بنیادی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ انسان کی بنیادی فطرت ہر ملک اور ہر عہد میں ایک ہی رہتی ہے انسانی فطرت جن ناقابل تغیر خصوصیات پر مبنی ہے وہ امتدادِ زمانہ اور تغیر احوال کے باوجود یکساں اور غیر متبدل ہے۔ لہذا انسانی تاریخ میں کوئی چیز نئی نہیں۔ کیونکہ جو قوتیں اس کی تعمیر کرتی ہیں یعنی انسانی احساسات اور جذبات اور معاشی اور عقلی مقتضیات، وہ با ایں ہمہ اختلاف زمان و مکاں یکساں ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ ظاہر میں ہے باطن میں نہیں تہذیب کے جس قافلہ نے غاروں سے محلات تک، پتھر کے اوزاروں سے جوہری بم تک، گدھوں اور ٹٹوؤں کی سواری سے ریلوں اور ہوائی جہازوں تک، برہنگی سے دیبا و حریر کے لباسوں تک، تصویری نقوش سے طباعت تک ترقی کی ہے۔ اس کو سرگرم عمل کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف شوق تجسس، سبقت اور تعمیر کا ذوق ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اگر کچھ فرق ہوا ہے تو ان کی قوت کارکردگی میں بیل گاڑی ہانکنے والے ابن آدم کے احساسات بھی دراصل محدود پیمانے پر بالکل ویسے ہی تھے جیسے وسیع پیمانہ

۱۔ Civilization on Trial by A. J. Toynbee.
P. 34. 35. 36.

پر موٹر چلانے والے خاکی پتلے کے۔ اختلاف جو کچھ ہے۔ وہ رفتار اور ساخت کا ہے۔ جو محرکات آج ہمیں جنگ اور صلح، دوستی اور دشمنی، تعمیر اور تخریب کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ ان محرکات سے کسی طرح مختلف نہیں جو زمنہ گذشتہ کے انسانوں کو اسی طرف لے جاتے تھے۔ وہ جذبۂ رقابت جو زمانۂ قبل از تاریخ کے وحشیوں میں پایا جاتا تھا۔ وہی آج کے مہذب انسانوں میں موجود ہے۔

اگر کل غاروں میں رہنے والے غیر مہذب انسان شکار کئے ہوئے گوشت کی تقسیم پر آپس میں سر پھٹول پر آمادہ ہو جاتے تھے تو آج منڈیوں اور نوآبادیوں پر قبضہ جمانے کے لئے ان سے زیادہ درندگی اور شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ کل اگر جنگ پتھروں اور تیروں سے ہوتی تھی، تو آج ایٹم بم اور کاسمک ریز (Cosmio Rays) ایجاد کرلی گئی ہیں۔ فرعون تو صدیاں ہوئیں دنیا سے نیست و نابود ہو چکا ہے۔ مگر فرعونیت اپنی پوری آب و تاب سے دنیا میں جلوہ گر ہے۔

تمدن کی ایک خاص روح ہوتی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ زندگی کی یہ چنگاری دب سکتی ہے لیکن بجھ نہیں سکتی۔ بس ذرا سی ہوا دینے سے از سر نو اسی طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ جس طرح پہلے کبھی بھڑکی تھی۔ جس طرح انسانوں کی فطرت چند افراد کے مرنے سے نہیں مرتی بلکہ وہی فطرت اپنا مظہر اسی قسم کے اور انسانوں کو بنا لیتی ہے۔ بالکل اسی انداز میں اجتماعی روح ایک قالب کو چھوڑتی ہے تو دوسرے میں جاگزیں ہو جاتی ہے

اور پھر نئے اختیار کردہ سماج میں ٹھیک اسی طرح کے مظاہر پیدا کرتی ہے۔ آیئے ہم ان واقعات کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

سب سے پہلے ہم کسی قوم کے فنون کو لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ فنون ہی وہ سب سے زیادہ حساس آئینے ہیں۔ جن میں ایک قوم کی روح بالکل واضح طور پر منعکس ہوتی ہے۔ سماج کے افراد میں جس قسم کے رجحانات ہوں گے اسی طرز پر ان کے آرٹ کی تکمیل ہوگی۔ خدا شناس تمدن کے اندر جو فنون ترقی پائیں گے ان کی خشت اوّل ہی یہ ہوگی کہ انسانی زندگی کو خدا کی مرضی کا پابند بنایا جائے۔ یہاں چونکہ تمدن کے بنیادی فلسفے کی رو سے انسان دنیا میں خدا کا نائب ہے، اس لئے یہ آرٹ انسانوں کو خدائی اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے پر ابھارتا ہے وہ انسانوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اور تعمیر پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس خدا ناشناس تمدنوں کے فنون ہر اس چیز پر زور دیتے ہیں جو نیکی، صداقت، راست بازی اور انسانیت کی ضد ہو۔ وہ انسانوں کو بہیمیت اختیار کرنے پر اکساتے ہیں۔ اس کے دیوتا کبھی بدمعاش، مجرم، عیار اور زانی ہوتے تھے۔ اب وہی کچھ اس کے ہیرو ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ شہوانی جذبہ کو ابھارنا ہوتا ہے

اب جہاں کہیں خدا ناشناس تمدن گیا اس کے ساتھ اسی قسم کے فنون نے ترقی کی۔ یہ آرٹ ازمنۂ گزشتہ کے بہت سے قبائل کا، پرانے مصریوں کا اور روم اور یونان کے وسطی دور میں بسنے والوں کا تھا اور پھر یہی مغربی دنیا میں پچھلے پانچ سو سالوں سے پوری آب و تاب سے

جلوہ افروز ہے۔ اسی طرح خداشناس تمدّن نے فنون کو اپنی روح سے متاثر کیا۔ یہ اپنی مخصوص صفات کے ساتھ دنیا میں ابھرا، یہ آرٹ کچھ وقت تک تبتیوں میں بدھ مذہب کے پیرؤں میں پرانے مصریوں اور یونان کے اندر نویں صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی قبل مسیح تک پایا گیا ہے پھر جہاں جہاں عیسائیت[1] اور اسلام گئے وہاں اس آرٹ کی ترقی ہوئی۔

تمدّن کی روح صرف آرٹ میں ہی جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ علم وسیاست معیشت ومعاشرت پر بھی اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ اپنے ماننے والوں میں ایک ہی طرح کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ جب ہم ایک مادّی تمدّن کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی بنیاد ہی حسیات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج پر رکھی گئی ہے۔ انسانوں کے لئے اس سے زیادہ آسان اور عام بنیاد اور کوئی نہیں اس سے زیادہ انسانوں کی حیوانی خواہشات کو تسکین دینے والا کوئی نظام نہیں۔ اس لئے یہ عام انسانوں کیلئے سب سے زیادہ کشش کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس تمدّن کی تحلیل کر کے اگر ان اجزا کو خارج کر دیا جائے جو اصل نہیں بلکہ فردعات اور مظاہر ہیں۔ تو ہم اس کا ایک مخصوص مزاج پاتے ہیں جس کی خصوصیات غیر محسوس حقائق کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ، خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی، دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیا کے فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید

---

[1] The Crisis of our Age by Pitirim A. Sorokin. P. 32

حب الوطنی اور گروہی عصبیت میں افراط و غلو ہیں۔

اب دیکھیے جہاں جہاں یہ تمدن اپنایا گیا زمان و مکان کے وسیع اختلافات کے باوجود اس نے ہر جگہ اور ہر قوم میں ایک ہی قسم کے اثرات چھوڑے۔ باقی افعال کو تو جانے دیجئے، نقشہ حیات کے خالص مذہبی اور روحانی خانے بھی اسی مادہ پرستانہ ذہنیت سے تابندہ ہو گئے اس کی روح اسے اپنانے والی قوم کے رگ و پے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی کہ اس کے افراد کا ہر شعوری اور ارادی فعل اسی کی غمازی کرنے لگا۔

جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ سب سے پہلی قوم جس نے اس تمدن کو اپنایا وہ جزیرۃ العرب کی ایک قوم "عاد" تھی۔ اس قوم کی زندگی خالص خدا ناشناس اور منکر آخرت قوم کی زندگی تھی، وہ بے ضرورت لطف و تفریح یا نام و نمود کیلئے بڑی بڑی عمارتیں اور یادگاریں تعمیر کرتے تھے جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بنانے والے آخرت کو یکسر فراموش کر چکے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ ان کی دار و گیر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوا کسی بلند و بالا طاقت کا یقین نہیں رکھتے۔

اس کی جانشین قوم "ثمود" نے بھی اسی تمدن کا خیر مقدم کیا۔ اس قوم کے افراد کا بھی دنیوی زندگی میں انہماک اور اس میں ان کے سکون و اطمینان آخروی زندگی سے غفلت اور اس معاملہ میں ان کی بے سر و سامانی دیکھ کر اسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے تھے جو ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو۔ حسیت و مادیت ان کا اصل شعار تھا۔

رومی تمدن بھی اسی حسیت اور مادہ پرستی کا شاہکار ہے۔ اس میں بھی حسی فلسفۂ اخلاق و اجتماع، مادہ پرستانہ مقصد زندگی اور طرز زندگی پورے طور پر نمایاں ہیں اور خیالات و افکار، علوم و فلسفہ اور تمدن و تہذیب کا یہی ترکہ ہے جو مغرب کو میراث میں ملا ہے۔ رومی تہذیب کی عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوئی تھی اور آج مغربی تہذیب کی سربفلک عمارت بھی اسی اساس پر اٹھائی گئی ہے۔ دنیا طلبی اور شکم پروری کا طوفان دونوں میں ایک ہی طرح کا ہے۔ مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس دونوں میں ایک جیسی ہے۔ دولت اور عزّ و جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار اگر رومی و یونانی تہذیب میں ناکافی محسوس ہوتی تھی تو آج بھی دنیاوی لذائذ کی اونچی سے اونچی سطح بھی انسان کی تشفی نہیں کر سکتی۔

جدید تہذیب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک مفکر نے کہا ہے: "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں۔ جو دینی طرز پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشستی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنیوالا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے۔ وہ کیا؟ مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس کی زندگی کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ

آسان اور پُر راحت اور بے قید بنایا جائے اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست کارخانے، تھیٹر، تفریح گاہیں کیمیاوی دار الصنعت ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں! اس مذہب کے پروہت بینکوں کے ڈائرکٹرز انجینئرز فلم اسٹارز اور تجارت وصنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ طاقت ولذت کی اس ہوس اور چھچھورپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں اور ایکدوسرے کے تباہ کر دینے کیلئے پر تول رہے ہیں اب اگر انکی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہوگیا تو کون جانے کیا ہوگا۔ جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے مادی فائدے کا۔ اس کے نزدیک کامیابی کا معیار محض مادی کامیابی ہے۔

یہ تو ہوا اقوام کا مزاج اجتماعی جس میں اس قدر یگانگت دیکھنے میں آتی ہے۔ آیئے اب تہذیب کے چند اصولوں کو لیجیئے اور پھر دیکھیئے کہ یہ مسائل کس طرح ہمارے سامنے بار بار ابھرتے رہے ہیں اور ایک ہی نظریۂ حیات رکھنے والی مختلف اقوام کس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر ان مسائل کو ایک ہی طرح سے حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بطورِ مثال ایک سوال کو لیجیئے کہ فرد اور اجتماع کا رابطہ کیا ہونا چاہیئے اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد قدیم میں کوئی واضح اور مضبوط نظام نہیں تھا۔ لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہاں نظم اجتماعی کی کوئی ہیئت ہی نہ ہو اس نظام نے انفرادی آزادی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ یعنی اجتماعی

ہیئت فرد کے سامنے بالکل بے بس تھی۔ پھر اس کا روما کے اندر شہنشا ہیت کی شکل میں ردّ عمل ہوا۔ فرد کی شخصیت بالکل اجتماعیت کی محکوم بن کر رہ گئی اور فرد کی جان و مال قوم اور ملک کی بھینٹ چڑھنے لگی۔ پھر انقلاب فرانس کے دور میں واقعات نے یک لخت پلٹا کھایا اور فرد کو مکمل آزادی نصیب ہوئی پھر اشتراکی روس اور نازی جرمنی میں اس کے خلاف تحریکات اٹھیں اور فرد اجتماعیت کے طوفان میں بالکل غرق ہو کر رہ گیا۔ جرمنی کے وزیر داخلہ نے کہا تھا کہ ہٹلر کی خدمت کرنا جرمنی کی خدمت کرنا ہے اور جرمنی کی خدمت کرنا خدا کی عبادت ہے۔ اشتراکی ریاست اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ وہاں انسانوں کو حکومت کی رکشا میں صرف جوتا نہیں جاتا۔ بلکہ ان کے دل و دماغ پر مکمل قبضہ کر کے ان کے جذبات اور احساسات تک کی مکمل منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ آپ روس کے صدر کو جس نام سے چاہیں پکاریں۔ مگر اس کے اختیار اور اقتدار کا دائرہ کسی طرح ہٹلر اور مسولینی سے کم نہیں۔ اس کی ہر بات روس کا قانون ہے۔ ہٹلر اور سٹالین ایک ہی سیاسی تہذیب کے دو مظہر ہیں۔ اگرچہ باہم برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ فاشزم اور کمیونزم سیاسی منصوبہ بندی ہی کے دو پر تو ہیں۔ اگر بونا پارٹ اپنے عہد میں خفیہ پولیس کے سہاروں پر زندہ رہا۔ اگر قرون وسطی کے بادشاہ تلواروں کی مدد سے مسند اقتدار پر متمکن رہے تو آج کی دنیا کا سٹالن بھی گے۔ پی۔ یو کے بل بوتے پر جی رہا ہے۔

مزید مثال کیلئے انسان کے صنفی رابطے کو لیجئے۔ دور وحشت میں یہ تعلق

بالکل جانوروں کی طرح تھا۔ جہاں جذبات میں ذرا سی تحریک ہوئی صنف مخالف کے کسی فرد سے استفادہ کرلیا۔ اس دور سے ذرا آگے نکل کر نکاح کے معاہدے کو صنفی تعلقات کی اساس بنایا گیا۔ پھر خاندان معرض وجود میں آیا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد موجودہ علوم کے باوا آدم یعنی افلاطون نے دور جاہلیت کے صنفی تعلقات کی طرف عوام کو پھر دعوت دی۔ اس نے تجویز کیا کہ مقررہ اوقات پر تندرست مردوں اور عورتوں کو یک جا کر دیا جائے۔ ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہو گی ان کو اپنے ماں باپ کا علم نہیں ہوگا۔ ریاست ان بچوں کی خود پرورش کرے تاکہ ہر نئی نسل پرانی نسل کو اپنا والدین سمجھے اور کسی شخص کی محبت وعطوفت کا مرکز کوئی خاص بچہ نہ ہو سکے۔ اس طور پر ملک میں محبت وہمدردی کا عام جذبہ پیدا ہوگا [1]۔ کتنی بڑی فاش غلطی ہے اور کتنا بڑا عاقل شخص ریاست کے مفاد عمومی کی بے پناہ محبت میں کس طرح اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ رہا ہے۔

کچھ مدت کے بعد خاندانی سسٹم کی جڑیں پھر مضبوط ہوگئیں۔ لیکن دور جدید میں پھر باد مخالف چلی اور خصوصاً اشتراکی انقلاب کے آغاز میں تو صنفی انار کا وہ طوفان اٹھا جس نے زمانہ جاہلیت کی یاد از سر نو تازہ کر دی۔ اس کے ثبوت کے لئے "سوویٹ اشتراکیت بہ حیثیت ایک نئی تہذیب کے" سے ایک عبارت نقل کی جاتی ہے۔

• بالشویک نظام کے چند ابتدائی سالوں میں یہ خیال عام

[1] Plato—The Republic Book V, VI, VII.

تھا کہ صنفی تعلق ایک ایسا ذاتی معاملہ ہے جو مختلف نسلوں رنگوں اور مذہب کے حامی مردوں اور عورتوں میں ان کی باہمی رضامندی سے طے ہوتا ہے۔ اس کے لئے سرکاری اندراج بھی ضروری نہیں۔ یہ جوڑے کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے "

چند سال گزرنے کے بعد لوگوں کے نقطہ نظر میں تبدیلی ہوئی۔ لینن نے صنفی روابط میں آوارگی کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اسے اس نظریہ سے شدید اختلاف تھا کہ صنفی جذبات کی تسکین پانی کا گلاس پی لینے کے مترادف سمجھی جائے۔ ریازانوف (Ryazanov) نے کہا۔ کیا نکاح دو ٹانگیں رکھنے والے جانوروں کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے جس کا تعلق محض ایک مرد عورت سے ہے اور جس میں سماج کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں پہنچتا؟ ہمیں نوجوان اشتراکیوں کو سمجھانا ہے۔ کہ عقد نکاح کسی فرد کا کوئی ذاتی فعل نہیں بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ نکاح کے دو پہلو ہیں۔ ایک ذاتی۔ دوسرا معاشرتی اور ہمیں اس کے معاشرتی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ ہم آوارہ زندگی کے سخت مخالف ہیں کیونکہ اس کا اثر بچوں پر پڑتا ہے"[1]

چنانچہ "بعد از خرابیٔ بسیار" خاندان اور نکاح کے نظام کو اب پھر سے وہاں زندہ کیا جا رہا ہے۔

---

[1] Soviet Communism-A New Civilization by Sidney and BeatriceWebb.

آگے چلئے شوریٰ اور جمہوریت کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ یہ نعمت عظمےٰ تو بالکل جدید دکھائی دیتی ہے حالانکہ عرب، یونان اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان سے بھی آگے نکل جائیے اور زمانۂ قبل از تاریخ میں اس کا سراغ لگائیے تو وہاں بھی جمہوریت اور شوریٰ کے تحائف موجود ملتے ہیں۔ یہ سب حقائق ایک ہی نتیجہ پر منتہی ہوتے ہیں کہ زمان و مکان بدلتے رہے، قومیں دنیا کے اسٹیج پر آتی اور جاتی رہیں۔ لیکن ہر دو قسم کے اصول نمودار ہوتے رہے۔ خود مادہ پرستانہ تمدن کبھی مصر اور شام میں جلوہ گر ہوا۔ کبھی عراق و ایران اس کے علمبردار بنے، کبھی روم اور یونان اس کے زیر اثر آگئے اور اب یہ مغربی اقوام پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ان سب کے اندر ایک ہی تہذیب نے فکر و عمل کی ایک ہی لہر دوڑائی ہے اور سب اقوام — جدید و قدیم — کے سامنے ایک ہی طرح کے مسائل پیش کئے ہیں۔ اور پھر انھوں نے ان تمام مسائل کو ایک مخصوص انداز فکر سے سلجھایا ہے۔ اس تمدن کے علمبرداروں میں، خواہ وہ کسی عہد اور کسی ملک کے رہنے والے تھے۔ بار بار ایک ہی طرح کے تموج رونما ہوتے رہے اور ان کے جذبات و احساسات میں ایک ہی نوعیت کے طوفان پھر پھر کر تلاطم برپا کرتے رہے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان مختلف اقوام کے ظاہری اختلافات کے باوجود جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اس تمدن کی ترتیب ہوئی وہ ایک ہیں۔ چنانچہ ان کے فکر و عمل کا رقاص اپنے مادی چوکھٹے میں نصب ہونے کی وجہ سے قدرتاً صرف حیوانی زندگی کی لذت و مسرت کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور رہے۔

• تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ؕ کا تماشہ صرف مٹی کے کرّوں پر ہی نہیں، بلکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی دکھایا جارہا ہے جس طرح آب و گل کی دنیا کا کچھ حصہ رات کی تاریکی میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے اور بقیہ حصہ سورج کی شعاعوں سے منور ہو جاتا ہے بالکل اسی انداز میں جب کبھی انسان کی اجتماعی زندگی پر دین حق کا آفتاب چمکنے لگتا ہے تو روشن دور تہذیب کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ وہ تہذیب جو تسکین بخش ہے۔ جس میں جوہر انسانیت بدرجہ کمال ہے۔ جو اپنے دامن میں استقامت اور صبر و سکون کے خزائن رکھتی ہے۔ جو انسانوں کے دامن کو ناجائز خود غرضی اور ناجائز نفع اندوزی سے پاک رکھتی ہے۔ اس کے برعکس جب رات کی تاریکی کی طرح ایک خدانا شناس تمدن نوع انسانی کو اپنے بھیانک پروں میں چھپا لیتا ہے۔ تو انسانی زندگی پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ نوع انسانی کے سارے کے سارے سفلی جذبات اُبھر کر سطح پر آجاتے ہیں۔ وحشت و بربریت خواہ ترقی کے کیسے ہی خوشنما لباس پہن کر جلوہ افروز ہو۔ بہرحال دنیا کو اہل دنیا کے لئے جہنم بنا دیتی ہے۔ لیکن دن رات کے چکر میں اور تمدنوں کی گردش میں ایک نہایت اہم فرق ہے جس کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ عالم طبیعات قانون فطرت کے اٹل قانون کا پابند ہے

جس سے کسی صورت بھی مفر نہیں۔ ایک خاص وقفہ گزر جانے کے بعد رات کو بہرحال آنا ہے پھر رات کے بعد صبح کو ضرور نمودار ہونا ہے۔ چکر کو کسی طرح روکا نہیں جاسکتا مگر تہذیبوں کا معاملہ اور نظریات اور قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے ان سب

کا محرک ایک ارادہ ہے جس کا تمام تر انحصار انسانوں کے اپنے انتخاب پر ہے اس لئے اگر مختلف تمدنوں کو دنیا میں عروج و زوال آتا ہے تو یہ اُن کے علمبرداروں کی توجہ اور عدم توجہ کا نتیجہ ہے۔ اہل مغرب نے ہزاروں سال کی متعفن رومی تہذیب کو پھر سے زندہ کیا ہے اور اگرچہ موجودہ دنیا اس کے تلخ ثمرات کا بری طرح مزہ چکھ چکی ہے مگر پھر بھی وہ اس وقت تک غالب ہے کیونکہ اس کے فدائی ایک نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسان ہیں وہ زندگی کے ہر مقصد کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اپنی ہر مشکل کو اپنے تہذیبی اصولوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انھیں اپنی تہذیب پر اعتماد ہے۔ محض قرطاس کے خزانہ میں محفوظ تمدن کبھی بھی زندگی کی نعمت کو نہیں پا سکتا۔ اس کی زندگی کے لئے ناگزیر ہے کہ ایسے انسان اٹھیں جو اپنے اعمال کی تصویر میں اس کے رنگ بھرنے کے لئے تیار ہوں۔ صرف تیار ہی نہ ہوں بلکہ اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کریں۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں سارا کھیل فکر و عمل کا ہے کوئی تمدن بھی کسی قوم کی میراث نہیں۔ جو بھی جس طرف قدم اٹھائے یہ اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ سارا معاملہ اس کے علمبرداروں کی نیت، وابستگی، ایثار اور قوت کارکردگی پر منحصر ہے۔

اسے انسان کی بدقسمتی کہئے کہ جدید فلسفہ کی بنیاد ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان کو بھی ایک حیوان سمجھا گیا ہے۔ اور انسان کی اجتماعی

زندگی کو ایک نظام جسمانی پر قیاس کر کے از خود فرض کر لیا گیا ہے۔ کہ جو قانون انسانوں کی زندگی اور موت پر جاری ہے۔ وہی تہذیب کی حیات و ممات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ لہٰذا جو تہذیب ایک دفعہ وجود میں آگئی ہے اسے انسانی زندگی کی ساری منازل میں سے گزر کر بالآخر موت کی آغوش میں جا گرنا ہے۔ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی، زندگی اور موت کے اس قانون طبعی کی پابند نہیں ہو سکتی۔ قوموں کی اجتماعی روح اپنے قالب تو بدل سکتی ہے مگر ختم نہیں ہو سکتی۔ اس پر تناسخ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک قالب کو چھوڑتی اور دوسرے میں جاگزیں ہوتی ہے۔ مگر دنیا سے ناپید نہیں ہوتی۔ رومی مٹ چکے ہیں، یونانی دنیا کی امامت سے ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ایرانی اور عربی خوشحالی کی زندگی بسر کر کے اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے مدفن میں ان کی تہذیبی روح کبھی دفن نہیں کی جا سکی۔ وہ زندہ رہتی ہے۔ اور جو قوم بھی اس کو دعوت دے وہ اس کی آواز پر لبیک کہہ کر اس کے جسم میں نشیمن بنا لیتی ہے لیکن ~~سپنگلر اور~~ اس کے ساتھیوں نے اس زبردست حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ایک تمدن جو ایک دفعہ فنا کے گھاٹ اتر چکا ہے اس کے بقا کی دوبارہ کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جن لوگوں نے بھی تمدن سے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے وہ ابھی تک یقین کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ تمدن کی طفولیت اور تمدن کے شباب سے انکی کیا مراد ہے ان کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں

ختم ہوتی ہیں۔ ایک تمدن کب اور کس وقت آتا ہے اور اس کی موت کا کیا مطلب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ تھیوری غیر واضح الفاظ کا ایک گورکھ دھندا ہے جس طرح ایک خاص طرز زندگی چھوڑ کر دوسرا طرز اختیار کر لیتا ہے تو یہ تبدیلی اس کی موت نہیں سمجھی جا سکتی۔ اسی طرح ایک تمدن کی ظاہری شکل میں کوئی معمولی تبدیلی اس کی موت نہیں سمجھی جا سکتی۔ تمدن ایک نظام جسمانی نہیں بلکہ یہ ایک تحریک ہے جو کمزور تو پڑ سکتی ہے مٹ نہیں سکتی۔ افراد جلد جلد مٹنے والے ہیں۔ لیکن قومیں اپنی آئندہ نسلوں کے ذریعے اپنی زندگی کو دائمی بنا لیتی ہیں ان کی زندگی غیر منقطع ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو عالم اسلام کے مفکر علامہ اقبال مرحوم نے "رموز بے خودی" میں استعارہ اور تشبیہ کی زبان میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ باوجود گل ونسترن کے مرجھا جانے کے فصل بہاراں باقی رہتی ہے۔ گوہروں کی کان میں سے اگر دو ایک گوہر نکل جائیں، تو اس پر کچھ اثر نہ پڑے گا اور نہ اس میں کسی قسم کی کمی محسوس کی جائے گی۔ خم ایام میں سے روز و شب ان گنت جام کے جام پے درپے میخواران حیات کو ملتے ہیں لیکن وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے اس طرح ملت کی تقویم فرد کی تقویم سے جداگانہ ہے اور اس کی مرگ وحیات کا قانون بھی مختلف ہے۔

فصل گل از نسترن باقی تر است	از گل و سرو و سمن باقی تر است
کان گوہر پردرے گوہر گرے	کم نگردد از شکست گوہرے
صبح از مشرق ز مغرب شام رفت	جام صد روز از خم ایام رفت

دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است باده ها خوردند و صہبا باقی است

ہست تقویم اُمم پائندہ تر ہم چناں از فردہائے پے سپر

فرد در گیر است و ملت قائم است در سفر یار است و صحبت قائم است

سنت مرگ و حیاتش دیگر است ذاتِ اُو دیگر صفاتش دیگر است

قوم را صد سال مثل یک نفس فرد پور شصت و ہفتاد است و بس

یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اسلامی الہیات کی جدید تشکیل میں شپنگلر کے اسی نظریہ سے متعلق بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے "شپنگلر اپنے نظریہ تمدن کے مطابق یہ کہتے ہوئے کہ ہر تمدن ایک خاص نظام جسمانی ہے جس کا دوسرے تمدنوں سے جو پہلے گزر چکے ہیں کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ جدید یورپین تہذیب رُوح کے اعتبار سے بالکل غیر کلاسیکی ہے۔ اور اس کے ثبوت میں وہ واقعات اور حقائق کو بُری طرح مسخ کرکے پیش کرتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ یورپ کی غیر کلاسیکی روح یورپ کی مخصوص ذہانت کی رہین منت ہے جس میں اسلامی تمدن کی روح کو کوئی دخل نہیں۔ میں نے ان لیکچروں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید دنیا کی غیر کلاسیکی روح اسلام کی یونانی افکار کے خلاف بغاوت کی پیداوار ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شپنگلر اس نظریہ کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موجودہ تمدن میں گزرے ہوئے تمدن کی روحانی تاثیر بھی شامل ہے تو اس سے شپنگلر کے اس فلسفے کی کہ ہر تمدن اپنی اپنی جگہ خود مختار اور ایک دوسرے سے

بے تعلق ہے ـــ پوری عمارت پیوند خاک ہو جاتی ہے[۱] ۔شپنگلر نے اپنے دعوے کی تائید حاصل کرنے کے لئے اسلام کی روح کو بحیثیت ایک تمدنی تحریک کے بالکل مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ تمدن نے بہت کچھ عربوں سے لیا۔ عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں ـــ علی الخصوص علمی کتابوں پر پانچ چھ صدی تک یورپ کے کل دارالعلوموں کی تعلیم کا دار و مدار رہا۔ بعض علوم میں، مثلاً طب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کا تسلط خود ہمارے زمانے تک رہا ہے۔ کیونکہ گزشتہ صدی کے آخر تک فرانس میں ابن سینا کی تصنیفات پر شروح لکھی جاتی تھیں۔ اسلامی تمدن نے یورپی تمدن کو اس حد تک متاثر کیا کہ موسیو لیبون کو لکھنا پڑا کہ :۔

"تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کی روشنی کے مقابلہ میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس وقت تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے"[۲]

فکر و نظر کا یہ انقلاب قرآن حکیم کی اس تعلیم کا نتیجہ ہے جو اس نے اپنے ماننے والوں کو انفس و آفاق پر غور کرنے کے متعلق دی۔ اس انقلاب کے نتائج بڑے ہی دُور رس تھے۔ مسلمانوں نے پرانے بندھن توڑ کر ایک نیا طریق فکر اختیار کیا۔ ایک نئے نظام فلسفہ کی بنیاد رکھی اور ایک نئی حکمت طبعی

---

[۱] Reconstruction of Religious Thought in Islam.

[۲] تمدن عرب از گستاؤلیبون

(Natural Science) کی داغ بیل ڈالی جس کی اساس قرآن پاک کی تعلیم تھی مسلمان جہاں کہیں گئے انھوں نے وہاں کی پوری فضا کو اس نئے طرزفکر سے متاثر کیا۔ کلاسیکی سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرارت اور حرکت کے اصول کو زندگی کا راہبر بنایا گیا۔ کلاسیکی منطق کے اصول کی تردید کی گئی۔ قیاس وظن وتخمین کی جگہ علم کا ماخذ احساس وشعور قرار پایا۔ اور استقرار کو استدلال کا قابل اعتماد طریقہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اسلام نے تاریخ عالم کو مسلسل اجتماعی حرکت وارتقا سے تعبیر کرکے اسے ایسی تخلیقی تحریک کا سبب قرار دیا جس میں انسانی اختیار کی کارروائی موجود رہتی ہے۔ پھر اس کے علاوہ علم حساب کی بجائے جبر ومقابلہ کی طرف اسلامی حکمار اور اس کے بعد میں آنے والے غیر اسلامی حساب دانوں نے جو توجہ کی اس کی وجہ بھی کائنات کا وہی مخصوص نقطۂ نظر تھا جو اسلامی تہذیب و تصورات میں مضمر ہے [۲]

مسلمان جب تک ذہنی، اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے دنیا میں غالب رہے اس وقت تک ان کے نظام فلسفہ نے کسی کو سر اٹھانے کا موقعہ نہ دیا۔ جب تک یہ لوگ اپنے فکری نظام کے اندر تحقیق وایجاد کی تازہ ہوا داخل کرتے رہے اس وقت تک دنیا میں ان کے تصورات غالب رہے حسن اور قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا معیار جو مسلمانوں نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار

The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Mohammad Iqbal.

پایا۔ اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افعال واعمال کو انھیں کے پیش کردہ معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں ارباب فکر واصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا جب وہ اکتساب علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو دنیا کی امامت سے ہٹا دیئے گئے ان کی اس شکست سے ان کے نظریات بھی مغلوب ہوئے۔ مگر یہ نظریے ناپید نہ ہونے اور اپنے سہاروں کے مٹ جانے کے بعد بھی آنے والے افکار کو برابر متاثر کرتے رہے۔ البتہ ان میں وہ دم خم باقی نہ رہا جو انھیں اپنے ماننے والوں کے غلبہ کے ساتھ نصیب تھا تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ دنیا میں بت پرستی اور شرک کا ہمیشہ کے لئے بے وقعت اور ذلیل ہو جانا اسلام کی دعوتِ توحید ہی کا نتیجہ تھا لوگوں کو اپنے اپنے مذاہب سے شرم آنے لگی اور ان سے وہ اپنے آپ کو بری ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یا پھر اپنے مذہب کے مشرکانہ اجزا واعمال کی تاویل وتوجیہہ اور اس کی تشریح کی ایسی کوشش کرتے کہ ان کے عقاید توحید سے ملتی جلتی چیز نظر آنے لگے۔ عیسائیوں میں ایسے گروہ پیدا ہوئے جو حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا انکار اور عقیدہ تثلیث کی توحید نما تشریح کرتے تھے۔ ان میں ایسے مصلحین بھی پیدا ہوئے جو عیسائیوں کے مذہبی گروہ اور اہل کلیسا کے اللہ اور بندے کے درمیان وساطت کے منکر ہو گئے۔ یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ذہنی اثرات کے اور بہت نمونے

ملیں گے۔ خود لوتھر کی مشہور تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی اور مورخین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس کے بانی پر اسلامی تمدن کے اثرات پڑے۔

اسلامی تمدن کی یہ لہر برابر بڑھتی رہی اور زمانہ رسا کی کوششوں کے باوجود) اسے دنیا سے مٹا دینے میں کامیاب نہ ہوا۔ دور حاضر کی اصلاحی تحریکات" ماڈرن ازم" ((Modernism) کے خواہ کتنے ہی رنگین لباس پہن کے آئیں۔ مگر دیکھنے والی آنکھیں پہچانتی ہیں کہ ان سطحی موجوں کے نیچے ایک خاموش طوفان انقلاب کی حیثیت میں موجود ہے۔ سطح بین آنکھیں صرف اوپر تیرنے والے خس وخاشاک، لہروں اور رووں، گردابوں اور بھنور دیکھنے میں مصروف رہتی ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتیں کہ نیچے کس قدر گہرائی ہے اور اس میں کون کون سی طاقتیں سرگرم عمل ہیں۔

اگر اسلامی تمدن کے اثرات کا مطالعہ مقصود ہو تو آپ اسلامی تہذیب مصنفہ خدابخش ((Islamic Civilization by Khuda Bux.) ترکۂ اسلام۔ مرتبہ تھامس آرنلڈ ((The Legacy of Islam by Thomas Atnold). مسلمان کلچر از وی۔وی بارٹولڈ ((Musalman Culture by V. V. Bartold) ہندوستانی تمدن پر اسلام کے اثرات از ڈاکٹر تارا چند — ((Influence of Islam on Indian Culture by Dr. Tara Chand) کو دیکھیں،

اِس سے آپ کو اسلامی تمدن کے جدید تہذیب پر گہرے اثرات کا ایک ہلکا سا اندازہ ہو سکے گا۔ مگر یہ یاد رہے کہ صرف مسلمانوں سے ہی پوری دنیا نے اخذ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں نے بھی دوسرے تمدنوں سے بہت کچھ سیکھا۔ سیکھنے کے ڈھنگ البتہ ہر دور میں مختلف رہے۔ جب تک مسلمانوں کو اپنے مقصد کی لگن بے تاب کرتی رہی، جب تک وہ توحید کے نشہ میں سرشار رہے جب تک قرآن پاک کا بتایا ہوا نصب العین ان کی زندگیوں کو گرماتا رہا۔ ان کے افکار میں اتنی حرارت تھی کہ وہ دوسرے نظریات کو اپنے ہادیٔ برحق کی تعلیم کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔ اور ہر چیز کو جوں کا توں قبول نہ کرتے بلکہ جب بھی کچھ لیتے تو اسے اتنا پاک اور مصفا کر لیتے کہ اس میں جاہلیت کی کوئی آلائش تک باقی نہ رہتی۔

عہد حاضر کے ایک مستشرق نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے

"اسلامی تعلیمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ سوائے مشرکانہ عقائد کے باقی ہر چیز اس کے دائرہ کے اندر آسکتی ہے اور مسلمان جائز افکار کو وقتاً فوقتاً قبول کرتے رہے ہیں البتہ وہ ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے اور ان کی نشو و نما بھی اپنے ڈھنگ پر کرتے تھے۔"

اسلامی تعلیمات کی اس جذب کن خصوصیت (Assimilative Character)، کا ذکر اسلام کے ایک اطالوی نقاد پروفیسر ر (Hurgronje)، نے بھی کیا ہے،

اس نے کہا :-

" محمڈن لاز کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں عجیب الجھن پیش آئی ہے ۔ ایک طرف تو مسلمان علماء معمولی اختلافات کی بناء پر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں مگر دوسری طرف یہی لوگ مقصد کی یگانگت کی وجہ سے اپنے پیشروؤں کے اختلافات مٹاتے بھی رہتے ہیں "

مگر یہ صورت ہمیشہ قائم نہ رہ سکی ۔ جب مسلمانوں نے اپنے خدا سے منہ موڑ کر دنیاوی لذائذ سے اپنا رشتہ جوڑنا سیکھا ۔ جب اُن کے اندر جہاد کا ولولہ اور فکر و تحقیق کا جذبہ ختم ہو گیا ۔ جب دین کو سربلند رکھنے کا عزم ان میں باقی نہ رہا یا دوسرے الفاظ میں جب مسلمانوں نے دوسری دلچسپیوں میں گم ہو کر غایت الغایات کو نظر انداز کر دیا تو اُن کے فکر میں اب اتنی حرارت باقی نہ رہی کہ وہ دوسری اقوام کی تحقیقات کو پگھلا کر اپنے سانچوں میں ڈھال سکتے ۔ بلکہ دوسری اقوام نے اپنی زندگی کی حرارت سے مسلمانوں کو جھلس دیا ۔ اور اس قوم کے کمزور پڑ جانے سے اس کے افکار بھی کمزور پڑ گئے ۔ مگر وہ دنیا سے مٹ نہ سکے ۔ اور کسی نہ کسی شکل میں دنیا میں باقی رہے ۔

دنیا میں جیسا کہ میں نے پہلے گزارش کی ہے ، ہر قوم کی اپنی رُوح ہوتی ہے جس کی قوت پر اس قوم کی زندگی اور اس کے تصورات کا انحصار ہوتا جب وہ تخلیقی ذہانت ر (Creative Genius) ماند پڑ جاتی ہے تو اُس کے ساتھ وہ قوم اور اُس کے نظریات بھی کمزور پڑ جاتے ہیں قوم کے افراد تو کچھ مدت

گزرنے کے بعد دنیا سے نیست ونابود ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کے پیش کردہ افکار دبی ہوئی چنگاریوں میں موجود رہتے ہیں۔ اور جب بھی انسانوں کا کوئی گروہ عمل کے جوش سے ان کو ہوا دیتا ہے تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں

دنیا کا ہر تمدن ماضی کے بطن ہی سے جنم لیتا ہے۔ البتہ اس کی پرورش حال کی گود میں ہوتی ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یکایک ایک ایسا تمدن معرضِ وجود میں آئے جس کا کوئی تعلق ہی گزرے ہوئے تمدنوں سے نہ ہو۔ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر نئے تمدن کے ساتھ دنیا میں بالکل نئے انسان بھی پیدا کئے جائیں۔ جن کی ذہنی ساخت انوکھی ہو۔ ان کی شعوری اور لاشعوری قوتیں نرالی ہوں۔ ان کے محرکات بالکل الگ ہوں اور احساسات بالکل نئے ہوں۔ مگر ظاہر ہے کہ دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ انسان کی بنیادی فطرت میں آج تک کوئی قابل ذکر انقلاب نہیں آیا۔ لہٰذا اس کی زندگی کے اصول بھی لازماً وہی ہونے چاہئیں جن سے اُن کی فطرت کسی حد تک پہلے سے آشنا ہو ورنہ اس کے لئے زندگی سراپا عذاب بن جائے گی۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب "اسلامی الہیات" کی تشکیل جدید میں لکھا ہے۔

"ہمیں اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیئے کہ زندگی سراپا انقلاب اور تغیر ہی نہیں بلکہ اس میں بہت سے ماضی کے عناصر بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ جب انسان تخلیقی قوتوں کو کام میں لاکر زندگی کے نئے تصورات اور مناظر کا کھوج لگاتا ہے تو اپنے آپ کو انئے ماحول میں

اجنبی محسوس کرتا ہے۔ ہر انسان آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماضی پر برابر
نگاہ رکھنے پر مجبور ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں
کہ زندگی اپنی پشت پر ماضی کا بوجھ لادے ہوئے آگے بڑھتی
ہے۔ لہذا معاشرتی انقلاب میں ماضی کی قوتوں کی اہمیت کو
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی قوم بھی ماضی کو پس پشت نہیں
ڈال سکتی۔"

انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر سچائیاں ہیں جن کو سب انسان
جانتے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی چھپی ہوئی چیزیں نہیں کہ انھیں کہیں سے
ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو ہر انسان کی ایسی جانی پہچانی چیزیں
ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں داخل ہے۔

اس سے یہ واضح ہے کہ تمدن کے تصورات دھارے کی طرح بہتے
رہتے ہیں۔ مگر جب اسے اردگرد سے پانی ملنا بند ہو جاتا ہے اور اسے خود
بھی ریتلی اور بنجر زمین میں سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ کمزور پڑ جاتا ہے اس
کے صاف کرنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کیا جائے تو اس میں مختلف
چیزیں حل کر صاف پانی کو گدلا بنا دیتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر اس دھارے
کو برابر پانی ملتا رہے اور مناسب تدابیر سے اس کو صاف رکھنے کا بندوبست
کیا جا سکے تو وہ اپنی اصلی شکل میں ایک غیر معین مدت تک زندہ رہ سکتا
ہے۔ مگر اس کے حفظ و بقا میں اصل اور فیصلہ کن قوت وہ لوگ ہیں جو
اس کو جاری رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کے متمنی ہیں۔

شپنگلر نے تمدن کو سمجھنے میں ایک زبردست غلطی جو کی ہے وہ یہ کہ اس نے ہیگل اور مارکس کی طرح ہر دور کو ایک وجود عضوی (Organism) قیاس کرتے ہوئے اس کے مطابق تمدن کے عروج وزوال کے اصول وضع کئے ہیں۔ اس غلطی کا سرچشمہ دراصل سائنس کا وہ بحران ہے جس نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مادی ترقی کی وجہ سے یورپی مفکرین اب یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے صرف مادہ ہے۔ چونکہ مادہ کو مقدار اور خصوصیات کے لحاظ سے ناپا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک صرف وہی علوم قابل قدر ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی کے حیوانی پہلو سے ہے۔ رہے وہ علوم جو انسان کا بہ حیثیت صاحب ارادہ واختیار مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان کی حیثیت ان کی نظر میں قیاس آرائی سے کچھ زیادہ نہیں شپنگلر پہلے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے انسان پر بحیثیت وجود عضوی کے غور وفکر کیا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تمدن بھی ایک فرد کی طرح طفولیت، جوانی اور بڑھاپے کی منازل سے گزر کر موت کے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو جاتا ہے۔ شپنگلر نے بھی حیاتیات کے ماہرین کی طرح انسان کے اس حصے کو یکسر فراموش کر دیا جس کا تعلق اختیار (Freewill) سے ہے۔ لیکن انسان کے صرف حیوانی پہلو کا مطالعہ پورے انسان کا مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک پہلو سے اس پر بحث نہ صرف ادھوری ہو گی بلکہ اس میں بہت سی خامیاں بھی موجود ہوں گی۔ اسی طرح تمدن کے متعلق وہ نظریہ جس میں قوموں کی قوت ارادی کو نظر انداز کیا گیا ہو، وہ کبھی بھی صحیح نہیں ہو سکتا

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی فکر و عمل نے بعض اوقات واقعات کے دھارے کا رُخ بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ انسانوں نے اپنی ہمت سے دم توڑتے تمدن کو نہ صرف چند دن کے لئے سنبھالا دیا بلکہ اسے پھر سے شباب بھی عطا کیا۔

اسی غلطی کا ایک دوسرا پہلو اس سے زیادہ افسوس ناک ہے جن لوگوں نے بھی سماج کو نظام جسمانی سمجھتے ہوئے افراد کو محض خلیہ قرار دیا انھوں نے حقیقت میں ایک زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ ہیگل، مارکس، شپنگلر اور اسی نوع کے دوسرے فلسفی اور ماہرین عمرانیات سب اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں ان میں سے ہیگل اور مارکس نے تو ایک فرد کو ریاست کی بھینٹ چڑھا کر اس کی انفرادیت کو بالکل ختم کر دیا۔ شپنگلر نے تمدنوں کی زندگی اور موت میں جبریت کا عنصر غالب سمجھتے ہوئے نہ صرف سماج میں قنوطیت کا بیج بو یا۔ بلکہ انفرادی زندگی میں ترقی کے سب راستوں کو مسدود کر کے اسے یکسر تاریک بنا دیا ہے ہر فرد تمدن کا محض ایک خلیہ ((Cell)) ہونے سے اسی کی زندگی کے مدوجزر کے ساتھ بہنے پر مجبور ہے۔ وہ کوئی الگ راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر تمدن موت کی آغوش میں دم توڑ رہا ہے تو اس کے علمبرداروں کی زندگی پر موت کی سی کیفیت کا طاری ہونا بالکل طبعی بات ہے لیکن افراد کے ساتھ اس سے زیادہ ناانصافی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانوں کو اس قدر مجبور اور بے بس سمجھ لیا جائے (R. M. MacIver) ر۔ م۔ میکاور نے اپنی کتاب سماج ((Society)) میں لکھا ہے ۔۔۔

"اس نظریہ میں انسان کی انفرادیت سے پورا انصاف نہیں کیا گیا۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سماج ہی ایک فرد کے اندر زندہ ہوتا ہے۔ اور سانس لیتا ہے اور ہمارا شعور صرف سماجی شعور (Social Consciousness) کا مظہر ہے۔ سماج دراصل افراد سے زندہ ہے۔ یہ دعوےٰ بڑا ہی گمراہ کن ہے کہ ہمارا رشتہ سماج میں اس قسم کا ہے جس طرح کہ پتوں کا درخت یا خلیہ ( ) کا جسم سے۔ سماج کا لفظ اس وقت بالکل بے معنی ہے جب تک ہم فرد کی انفرادیت کو حقیقی اور اکیلی تسلیم نہ کریں۔ اس حیاتیاتی نظریہ کی خواہ کتنی ہی اہمیت ہو ہم اسے سماج اور افراد کے مابین تعلقات کی بنیاد قرار نہیں دے سکتے۔ یہ نظریہ انفرادی معاہدہ عمرانی (Individualistic Social Contract) کی طرح تعلقات کے ایک پہلو کی یکسر نفی کرتا ہے[۱]"

فرد کو سماج کے طوفان میں گم کر دینے کے نتائج آج کس صاحب خرد سے پوشیدہ ہیں۔ سلطنتوں کی سلطنتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ قومیں ہر اصول کو پس پشت ڈال کر دنیا میں اپنی خداوندی کی ساکھ بٹھانے کی سعی کر رہی ہیں۔ ریاست کی دیوی کے سامنے انسانوں

---

[۱] Society by R. M. MacIver and Charles H. page (P. 44)

نے ہر قیمتی متاع کو لاکر ڈھیر کر دیا ہے۔ قوم کی خاطر کوئی بڑی سے بڑی بے اصولی بھی ایسی نہیں رہی جس کو جائز نہ سمجھا گیا ہو۔ پروفیسر سی۔ ای جوڈ نے اس کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

"قوم اپنی ذات میں ایک قانون ہے اور اس کی پالیسی میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہیئے حق وہ ہے جو اس کے لئے نفع بخش ہے۔ اخلاق وہ ہے جو اس کے لئے ضروری ہے۔ ہر فرکٹ نے کہا۔ ہٹلر جو کچھ فیصلہ کرتا ہے وہ صحیح ہے اور ابد تک صحیح رہے گا۔ حق کا معیار یہ ہے کہ جرمن قوم کو اس سے نفع ہو۔ باطل وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نقصان پہنچے مسیحی اور اخلاقی تعلیمات حکومت کے خارجی تعلقات پر منطبق نہیں ہوتیں۔ طاقت و غلبہ کے حصول یا اُن کی حفاظت کے لئے ایسے وسائل اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں جو اخلاق و شرافت سے موافقت نہ رکھتے ہوں۔ اس طرح قومیت ریاست کو معبود بنا دیتی ہے "۔[1]

یہ بگاڑ صرف قومی اخلاق میں رُونما نہیں ہوا۔ انفرادی زندگی میں بھی اس کی ہلاکت انگیزیاں کم نہیں۔ زندگی میں حق پرستی کے لئے کوئی چھوٹے سے

---

[1] A Guide to Modern Wickedness by C.E.M. Joad.

چھوٹا گوشہ بھی باقی نہیں رہا۔ قلب و روح کی جگہ دنیاوی ہوس نے لے لی جس سے زندگی کی تمام بلند اور لطیف حقیقتیں اوجھل ہو گئی ہیں اب مدت سے ہاتفِ غیب کی زبان پر ہے ؎

نہ ڈھونڈ اصل دل کو اب کہ جوشِ قلزمِ فنا
متاعِ درد جن میں تھی وہ کشتیاں ڈبو چکا

خدا طلبی کے بجائے اب اس کرّے پر دنیا طلبی کا دور ہے۔ بالشت بھر پیٹ نے دنیا کی ساری وسعتیں گھیر لی ہیں۔ خدا اور آخرت سے یقین بالکل اٹھ گیا۔ دل کی روشنی بجھ گئی ہے۔ نفس کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ انسان محض اغراض کا بندہ بن کر رہ گیا ہے۔ دورِ جدید کے ایک مورخ آرنلڈ ٹوئن (A. Toynbee) نے لکھا ہے۔

"جب ہم یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ ایک فرد سماج کے لئے ہی زندہ ہے تو اس سے انسانی زندگی کا کعبہ مقصود ہی بدل جاتا ہے اب انسانی زندگی میں سب سے اہم چیز افراد کی روحانی نشوونما نہیں بلکہ قوموں کے اقتدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر کسی طرح بھی درست نہیں اگر اسے صحیح جان کر ہم اس کے مطابق عمل کرنا شروع کریں تو دنیا میں اس سے سنگین قسم کی بداخلاقی جنم لے گی۔ یہ نظریہ کہ فرد محض سماج کا ایک بے جان حصہ ہے۔ کیڑوں مکوڑوں کے متعلق تو درست ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا اطلاق انسانوں

کبھی نہیں ہو سکتا [1]

جب ہم ایک فرد کو محض ایک قوم کا جزو سمجھتے ہیں تو اس سے انسان اور خدا کے درمیان تعلقات کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے اور خدا پرستی کی جگہ قوم لے لیتی ہے [2]

مجھے اس ضمن میں آخری بات جو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ تمدن سے شپنگلر کے نقطۂ نظر کے حامی اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تمدن کی ترقی اور تنزل سب اضافی باتیں ہیں۔ ترقی کا تعین آدرش ـ ( ) کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک تمدن ایک غیر مسلم کے نقطۂ نظر سے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو۔ مگر ایک مسلم کی نگاہ میں وہ حالت نزع میں گرفتار ہو۔ مثال کے طور غیر مسلم مورخین اور بعض مغرب زدہ مسلم مورخین بھی اسلامی تمدن کی ترقی کا زمانہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب اس کے پیروؤں کو جمشید اور قیصر و کسرےٰ کے سے شاہانہ اختیارات ملے۔ جب انھیں خسروانہ جلال اور غیر مسئول اقتدار نصیب ہوا۔ جب ان کے ہاں فنون لطیفہ نے ترقی کی۔ مگر ایک مسلمان کے نزدیک

---

[1] Civilization on Trial by Arnold Toynbee (page 254

[2] Ibid (Page 256)

وہی دور اسلامی تمدّن کے زوال کا تھا۔ اسلامی تمدن پر اس سے زیادہ اور منحوس گھڑی نہیں آئی کہ اس کے داعیوں کی زندگی نے دنیاوی لذائذ کے محور پر گھومنا شروع کر دیا۔ اور اُن کی آنکھوں سے
سے ان کا حقیقی نصب العین اوجھل ہو گیا۔ تمدن کے عروج وزوال کا فیصلہ نصب العین کی عدالت میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم ترقی اور تنزل کے متعلق کوئی حتمی اور معروضی معیار پیش نہیں کر سکتے۔

۲ کا ل

تاریخ کی مادّی تعبیر

اگر مارکسی فلسفہ حیات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بنیادی اہمیت تاریخ کی مادی تعبیر کو حاصل ہے۔ یہی وہ اساس ہے جس پر اشتراکی فکر و عمل کی سر بفلک عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ مارکس کا یہ تخیل کوئی اچھوتا نہیں اس نے اس کے ڈھانچہ کو ہیگل سے مستعار لے کر اس میں اپنی رُوح پھونک دی۔ اس حقیقت کا اعتراف خود مارکس نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم مارکس کا فلسفہ تاریخ بیان کرنے سے پہلے ہیگل کے فلسفہ تاریخ کے موٹے موٹے اصول بیان کر دیں۔ تاکہ مارکس کو سمجھنے میں کسی حد تک آسانی ہو سکے۔

ہیگل کے نزدیک تاریخ کا ہر دور ایک وحدت، ایک کل ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان کے معاشی، سیاسی تمدنی اور اخلاقی و عقلی

اور مذہبی تصورات ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک ہم آہنگی ہوتی ہے اور سب میں اس دور کی رُوح جاری وساری رہتی ہے جب تاریخ کا قافلہ بڑھتا ہے تو آگے چل کر خود اس دور کے اپنے ہی بطن سے پرورش پاکر اس کا ایک حریف میدان میں نمودار ہوتا ہے۔ یعنی کچھ نئے افکار، نئے رحجانات، نئے نظریات اور نئے اصول خود اس روبہ زوال دور کے طبعی تقاضے سے پیدا ہوجاتے ہیں اور پرانے افکار سے ان کی لڑائی شروع ہوجاتی ہے۔ کچھ مدت قدیم وجدید ایک دوسرے سے دست وگریباں رہتے ہیں۔ بالآخر کسر وانکسار کے بعد ان میں امتزاج پیدا ہوجاتا ہے اور اسی امتزاج سے ایک نئی تہذیب کا خمیر اٹھایا جاتا ہے جس میں پرانی تہذیبوں کے "صالح عناصر" برقرار رہتے ہیں۔ کچھ سال گزر جانے کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ اور انسانی تہذیب اس طرح سفر کرتی ہے۔ اسی عمل کو ہیگل جدلی عمل ر (Dialectical Process)) کہتا ہے۔ اس سارے عمل کی اصل محرک وہ "رُوح مطلق" ہے۔ جو اپنے ارتقا کے لئے دنیا میں سب کچھ کرا رہی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی شخصیتیں "روح مطلق" کے اشارے پر ناچ رہی ہیں۔ اور غلطی سے یہ گمان کر رہی ہیں کہ انھیں ارادہ واختیار حاصل ہے۔ پھر اس عمل میں فیصلہ کن جنگ افکار وتصورات کے اندر رہے۔ دنیاوی واقعات وحوادث محض اس کے پرتو ہیں۔ عالم خارجی بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ روح مطلق کے سفر ارتقا کے لئے نشانِ منزل کا کام دیتا ہے

چنانچہ اپنی کتاب فلسفۂ تاریخ میں وہ کہتا ہے:۔

"تاریخ عالم روح مطلق کی نمائش گاہ ہے جس طرح ایک بیج کی ساری خصوصیات ایک درخت، اس کے ثمر کے ذائقہ اور اس کی شکل و شباہت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بالکل اسی طرح روح ایک دور کے سارے مظاہر میں منعکس ہوتی ہے[1] بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دنیا ایک آئینہ ہے جس پر روح مطلق اپنے رُخِ زیبا کا عکس ڈالتی ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ چنانچہ انسانوں کی بے پناہ قوت ارادی ان کے مفادات، ان کی تگ و دو، سب کے سب اسی جانِ جہاں کے ذرائع اور آلۂ کار ہیں۔ جنھیں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کام میں لاتی ہے[2] تاریخی شخصیتیں روح عالم کے کھلونے اور اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ ان کے عزائم روح مطلق کی مرضی کا دوسرا نام ہیں۔ ان افراد کو کبھی اس حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔ کہ وہ اصل میں روح کے مظہر ہیں[3]"

---

[1] (Hegel's Philosophy of History, translated by J. Sibree, M.A.)

[2] Ibid—(page 26)

[3] Ibid—(page 31)

مارکس نے یہ سارا تخیل، ہیگل سے لیا مگر اس کے اپنے قول کے مطابق اسے الٹ کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ ہیگل کے نزدیک اگر مؤثر طاقت افکار میں تھی تو مارکس کی نظر میں فیصلہ کن قوت مادی ماحول میں کارفرما تھی پھر مارکس کی نگاہ میں مادی ماحول میں بھی حقیقی اہمیت ذرائع پیداوار کو حاصل ہے۔ اس نے فکر کی بجائے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخ ارتقا کی بنیاد قرار دیا۔ اس کے یہاں انسان کی زندگی میں سب سے اہم چیز معیشت ہے۔ اور اسی پر انسان کے اخلاق اور مذہبی معتقدات اور اس کے تمدن اور اس کے علوم و فنون کی بالائی عمارت قائم ہوتی ہے مادی زندگی کے حوائج و ضروریات ہر زمانے میں آفرینش دولت کے مخصوص طریقے وجود میں لاتے ہیں۔ دولت پیدا کرنے کے مخصوص طریقے اس دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ انسان کا طرز معاشرت اور طریق معیشت اس کے ذہن و شعور کے ارتقا سے متعین نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برخلاف انسانی ذہن و شعور کی حالت اس کی معاشرت اور طرز معیشت کی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ مخلوق ہوتی ہے اپنی شہرہ آفاق کتاب "سرمایہ" میں وہ کہتا ہے۔

"میرا جدلی عمل نہ صرف ہیگل سے مختلف ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہیگل کے خیال میں دنیا کا اصلی خالق فکر ہے۔ اور حقیقی دنیا محض اس کا مظہر، میرے ہاں تخیل مخلوق ہے۔ مادی دنیا کے پرتو کا جو کہ انسان کے دماغ پر پڑتا ہے [1]

---

[1] Capital by Karl Marx.

اسی طرح وہ (Critique of Political Economy)
کے دیباچہ میں سوال کرتا ہے کہ وہ کونسا ایسا اصول ہے جس پر تمام انسانی تعلقات کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ انسانی زندگی کا ایک عام مقصد جس کی لگن کسی متنفس کو چین نہیں لینے دیتی، انسانی بقا کے لئے ذرائع پیداوار کا مہیا کرنا ہے۔ اور پیدائش کے بعد ان اشیا کا تبادلہ۔ انسان کا اوّلین کام زندہ رہنا ہے۔ اور اس کے بعد وہ سوچتا ہے لہٰذا معاشرتی انقلاب میں اصل قوت ابدی سچائی اور اجتماعی عدل نہیں بلکہ ذرائع پیداوار اور دولت کے تبادلہ میں اہم تبدیلیاں ہیں۔

مارکس کے فلسفہ تاریخ کی تفصیلات کو اگر فی الحال نظر انداز کر دیں اور صرف اصل کو لے لیں تو یہ مندرجہ ذیل آٹھ نکات پر مشتمل ہے۔

(ا) پیدائش دولت کے عمل کے دوران میں انسان ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہیں۔ یہ تعلقات مادی قوتوں کی پیدائش ترقی کی ایک خاص منزل سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

(ب) تاریخ کے ہر دور میں افزائش دولت کے حالات اس دور کا معاشی نظام بناتے ہیں۔ اور یہی وہ اصل بنیادیں ہیں۔ جن پر اخلاق اور سیاسی دساتیر کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

(ج) سماج کی سیاسی اور علمی زندگی کا ہیولیٰ بھی انسانی احتیاجات کے

کے مطابق صرف طریق پیدائش ہی تیار کرتا ہے۔

(۵) انسانی زندگی کی تعمیر میں اصل محرک انسانی شعور نہیں بلکہ اس کے برعکس شعور کے بنانے میں کارفرما قوت اس دور کا معاشی نظام ہے۔

(۶) ایک زمانہ تک یہ معاشی نظام انسانی ضروریات وحاجات کی کفالت کرتا ہے۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس نظام کے اندر سے اس کی مخالف قوتیں ظاہر ہوتی ہیں جو اس نظام کی تخریب وشکست کے درپے ہوجاتی ہیں۔ پھر ان دونوں کے مابین تنازع شروع ہوتا ہے۔ اس تنازع کے نتیجہ کے طور پر ایک نیا معاشی نظام وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے میدان میں جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں وہ اس دنیا میں ایک معاشی نظام اور اس کے مخالف نظام کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اخلاق و مذہب، علوم و فنون اور تمدن و معاشرت سب کے سب ابن الوقتوں کی طرح اپنے زمانے کے غالب معاشی نظام کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ اور اسی کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ ان کی حیثیت متبعین کی سی ہے۔ اخلاقی اقدار بھی معاشی نظام کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اس لئے کسی ابدی قدر یا کسی حتمی اصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہر بات اپنے مخصوص معاشی حالات کے تحت ایک خاص وقت میں سچ ہوسکتی ہے ہر دور کا اپنا قرآن الگ ہے۔

(۷) ہر نئی پود کا مزاج جدتوں کا تسلسل ہے۔ اس لئے ہر نئی تہذیب پچھلی تہذیب سے ایک قدم آگے کو ہی رکھتی ہے پیچھے کو نہیں۔

(ز) دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عمل ارتقاء اور تاریخی وجوب کے تحت ہو رہا ہے۔ انسانی تاریخ میں وجوب ہی وجوب ہے۔ امکان نام کو بھی نہیں۔

(ح) انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں۔ ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء وجمہور، سرمایہ دار اور مزدور۔ مختصر یہ کہ ظالم اور مظلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف "روٹیوں کی تقسیم" پر باہم برسرپیکار رہے ہیں۔

یہ ہیں تاریخ کے متعلق مارکس کے وہ نظریات جنھوں نے اینجل کے قول کے مطابق تمدنی تعلقات کے علوم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا چنانچہ اس نے اس مفکر کی موت پر جن احساسات کا اظہار کیا۔ وہ اس قابل ہیں کہ انھیں پڑھا جائے۔

"جس طرح ڈاروِن نے فطرت میں قانون ارتقا کو دریافت کیا اسی طرح مارکس نے انسانی تاریخ میں اس قانون کو معلوم کیا۔ اس نے ایک ایسی بدیہی حقیقت کا کھوج لگایا۔ جو نظری بحثوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ نسل انسانی کو سب سے پہلے کھانے کے لئے خوراک۔ پینے کے لئے پانی، رہنے کے لئے مکان اور تن ڈھانکنے کے کپڑا میسر آنا چاہیے۔ اس سے پیشتر کہ وہ سیاست مذہب، سائنس اور دیگر فنون میں دلچسپی لے اس لئے روزی کمانے کیلئے ذرائع فراہم کرنا جن کا بیشتر انحصار ایک قوم کے حاصل کردہ

معاشی مرتبہ پر ہے۔ یہی وہ اصل بنیادیں ہیں جن پر کہ ریاستی ادارے قانونی تصورات، علوم وفنون، حتٰی کہ مذہبی معتقدات تعمیر ہوتے ہیں۔ اور انھیں کی رہنمائی میں ہمیں مختلف الجھنوں کو سلجھانا ہے ؎۱

اسے دنیا کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مارکس نے ایسے دور میں جنم لیا جب کہ اہل فکر کی نظریں اہل کلیسا کی غلط روش اور فکری جمود کی وجہ سے روحانیت سے سمٹ سمٹا کر صرف حیات اور عالم مادّی پر جم کر رہ گئیں تھیں اس کے علاوہ مادی وسائل کی کثرت نے یہ عقیدہ لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف مادہ ہے۔ نمو، حرکت، احساس، شعور، فکر سب اسی مادہ کے خواص ہیں انسان اور حیوان میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ اوّل الذکر موخرالذکر ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ دونوں کے دونوں زندگی کے ہر گوشے میں قانون طبعی کے پابند ہیں۔ انسان میں نہ کوئی ارادہ ہے اور نہ اختیار۔ دنیا کی ہر چیز کی طرح یہ بھی فطرت کے قانونِ جبر کا پابند ہے۔ سائنس کے نشہ سے سرشار ہونے والی فکر کے اس بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ فلسفہ جس کا تعلق انسان کی آزادی رائے (Freewill) اور اختیار سے تھا۔ وہ دنیا کی نظر میں حقیر سمجھا جانے لگا۔

؎۱ The Theory & Practice of Communism by R. N. Carew-Hunt.

ہر وہ عقیدہ جسے سائنس کے پیش کردہ پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا تھا اور ہر وہ اصول جو علم طبیعیات کے دوسرے اصولوں کی طرح قطعی اور حتمی نہیں تھا۔ دم توڑنے لگا۔ اب کسی فلسفہ یا علم کی ترقی کی صرف ایک ہی شکل باقی تھی کہ اس کا مزاج علم طبیعیات سے بہت حد تک ملتا جلتا ہو۔ اس کے قوانین بھی سائنس کی طرح حتمی ہوں۔ اس کے مختلف شعبوں میں نہایت ہی گہرا ربط پایا جائے۔ اس میں علت اور معلول کے رشتے نہایت ہی اٹل ہوں۔ نتائج کے پیدا ہونے میں اصل اور کارفرما قوت صرف ایک ہی ہو اور باقی سب اسی کے سہارے۔ پھر نتائج ناگزیر طور پر میکانکی طریق سے معرض وجود میں آتے چلے جائیں۔ اور اسباب نتائج میں کوئی چیز ایسی نہ ہو جو حواس خمسہ کی رسائی سے بچ سکے بلکہ ان کی شکل اتنی واضح اور ٹھوس ہو کہ ہم انھیں ناپ اور تول سکیں۔

یہ تھا اس فلسفہ تاریخ کا پس منظر! مارکس نے اپنی اس منزل مقصود کو حاصل کرنے کے لئے بعض بدیہی حقیقتوں کا انکار کیا۔ اپنا مطلب حل کرنے کے لئے بے شمار تاریخی واقعات کو مسخ کرکے رکھ دیا اور ہر وہ جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کیا جس سے اس کے فلسفہ کو کسی طرح تقویت پہونچتی ہو اگر آپ ان تصریحات کا مطالعہ کریں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے تو آپ بادی النظر میں محسوس کریں گے کہ مارکس نے اپنے فلسفہ تاریخ میں اس انسان سے بحث کی ہے جو پوری طرح جبریت میں جکڑا ہوئے ہے جو ایک حیوان ہونے کی وجہ سے صرف مادیت کے محور

گھومنے پر مجبور ہے جس کے اعمال و افعال کے محرکات صرف حیوانی ضروریات ہیں۔ جن کی پوری زندگی صرف ذرائع پیداوار کے سانچوں میں ڈھلتی رہتی ہے اور ان کے بدل جانے سے صرف اس کی طرز رہائش ہی نہیں بدلتی بلکہ معیار خیر و شر۔ معاشرتی اور سیاسی تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ ایسے انسان کی دنیا میں انقلابات کا اگر کوئی حقیقی خالق اور فرمانروا ہے تو صرف دولت پیدا کرنے کا طریق ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر وہ فلسفہ جو ایک انسانی زندگی کو مشین پر قیاس کرتے ہوئے اس کے اعمال کے متعلق اصول وضع کرے وہ لغزشوں اور خامیوں سے کبھی مبرا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میکوائر ((MacIver) مارکس کی مادی تعبیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"معاشرتی انقلاب اور معاشی طریقوں میں رابطہ براہ راست اتنا واضح نہیں جتنا کہ مارکسی فلسفہ تسلیم کرتا ہے۔ درحقیقت انسانی نفسیات سے عدم واقفیت نے جبری نظریۂ حیات کو جنم دیا ہے۔ مارکس نے دعویٰ کیا کہ نسل انسانی کے لئے سب سے زیادہ موثر چیز طریق پیداوار کی تبدیلی ہے لیکن پیداوار کے نظام میں تغیر کس طرح آتا ہے؟ مارکس اس سے کوئی بحث نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ عادات کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ اور دوسری طرف انقلاب کے اثرات سے تغافل برتتا ہے۔ وہ خاندانی عصبیت اور اس سے

وابستگی۔ اپنے پیشہ سے لگاؤ۔ اور قوم سے تعلق سب
کو معیشت کے تابع سمجھتا ہے۔ حالانکہ معاشیات تمام سماجی
مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس نے اپنے پیش کردہ
حل میں انسانی زندگی پر بہت سے دوسرے اثرانداز ہونے
والے عوامل کو یکسر نظرانداز کردیا ہے۔ موجودالوقت
معاشی تبدیلیوں کو ہی سماجی تبدیلیوں کی اصل غایت قرار
دینا بہت بڑی جسارت ہے۔ حقیقت میں اس امر کے لئے
قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ ان انقلابات کی وجہ صرف
ایک معاشی تبدیلی ہی کو سمجھ لیا جائے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ پیدائشی قوتیں جن کا مارکس اس قدر
ڈھنڈورا پیٹتا ہے یہ ہیں کیا؟ یہ کس طرح معرض وجود میں آتی ہیں ا
ان کی کس طریق پر نشوونما ہوتی ہے؟ یہ نسل انسانی کی ترقی میں حرف ا
ہیں یا حرف آخر؟

پیدائشی قوتیں دراصل وہ قوتیں ہیں جن کو انسان سامان معیشت
کی فراہمی کے سلسلے میں استعمال میں لاتا ہے مثلاً زرخیز زمین، دھات کے خواص
فطرت کی دوسری طاقتیں یعنی سورج کی روشنی، بھاپ، بجلی اور انسانی
حیوانی قوت۔

یہ تمام قوتیں روز ازل سے ہی دنیا میں موجود تھیں۔ لیکن نوع انسانی
ان سے ناآشنا تھی۔ انسان نے جب ترقی کی تو اس نے فطرت کے خزانوں کو

کھوج لگاکر ان پر قبضہ کیا اور انھیں اپنی خدمت کے لئے استعمال کرنے لگا تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سب سے زیادہ سعی انسانی عقل نے کی اگر مادی احتیاجات کو ہی ان تحقیقات کی علت غائی قرار دیا جائے اور ہر نئی قوت کے معلوم ہو جانے کو محض ایک اتفاق حادثہ سمجھا جائے تو یہ مسئلہ خاطر خواہ حل نہیں ہوتا۔ اگر ترقی کے اسباب صرف یہی دو ہیں تو آخر حیوانوں نے کیوں نہ ترقی کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں قوت فکر ناپید ہے۔ جو کسی کام کی تعمیر کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ پھر اس کام کو سرانجام دینے کی سعادت سب انسانوں کو یکساں طور پر نصیب نہ ہوئی۔ ان میں سے چند خوش نصیب ایسے تھے جن کو فطرت نے ذہانت کی قوت سے مالا مال کر رکھا تھا اور انھوں نے اپنے رجحان طبع کے مطابق اکتشافات کئے دنیا کے واقعات تو مارکس کے نظریۂ تاریخ کے خلاف کھلا چیلنج ہیں۔ مارکس کے نزدیک پیداواری قوتیں انسان کے سیاسی معاشرتی اور مذہبی تصورات کو جنم دیتی ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان کی ذہنی استعداد، اس کی قوت فکر اور رجحان طبع نے پیداواری قوتوں کا کھوج لگا کر انھیں استعمال میں لانے کے لئے ابن آدم کو نئے نئے طریقوں سے آشنا کیا[1]

مارکس اگر یہ کہتا ہے کہ انسان اپنے معاشی ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو یہ بات کسی حد تک معقول تھی اور کسی کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوتا۔ مارکس کا دعویٰ اس سے کہیں زیادہ ہے وہ پوری قوت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ

---

[1] The Material Conception of History, A Critical Analysis by Kar Federn.

حالات پیداوار بحیثیت مجموعی سوسائٹی کی تنظیم کا خاکہ بناتے ہیں۔ بلکہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر ملکی قوانین اور سیاسی اداروں کی بالائی عمارت قائم ہوتی ہے۔ مادی زندگی کی ضروریات ہر زمانہ میں آفرینش دولت کے مخصوص طریقے وجود میں لاتی ہیں۔ دولت پیدا کرنے کے یہ مخصوص طریقے اس دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ انسان کا طرز معاشرت اور طریق معیشت اس کے ذہن وشعور کے ارتقا سے متعین نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس انسانی ذہن وشعور کی حالت اس کی معاشرت اور طرز معیشت کی مخلوق ہوتی ہے۔[۱]

---

[۱]

"The sum total of these relations of producation constitutes the economic structure of sociaty the

real foundation on which rises a legal and political superstructure and in which correspond definite forms of social consciousness.

The Mode of production of material life determines the social political and intellectual life process in general. It is not the consciousness of men which determine their being buron the contrary their social being that determimes their consciousness."
(Karl Marx—Selected Works, Vol. I, page 96)

مارکس کے ان الفاظ کو پڑھ کر دو نتائج ہی نکالے جا سکتے ہیں۔

(۱) مارکس کی رائے میں انسانی اعمال میں سب سے زبردست اور کارفرما محرک صرف معاشی ہے۔

(۲) پیدائش دولت کے خاص طریقوں میں انسانوں کے ذہنی نقش ونگار بھی ایک ہی رنگ کے ہونے چاہئیں۔

لیکن عملی زندگی میں یہ نتائج ہمارے سامنے پیش نہیں آتے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جو افلاس کا شکار رہے ان تینوں متبادل راستوں میں سے جو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے چوری کر سکتا ہے۔ ڈاکہ ڈال سکتا ہے۔ خودکشی سے اپنی زندگی ختم کر سکتا ہے۔ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کر سکتا ہے۔ اور اگر طبیعت کا میلان ہو تو کسی سیاسی جماعت میں شریک ہو کر اپنے اور اپنے جیسے ہزاروں بھائیوں کے غصب شدہ حقوق کے حصول کے لئے جان کی بازی بھی لگا سکتا ہے۔ ان مختلف راستوں میں سے وہ کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ اس کے متعلق خالص علم معاشیات کوئی حتمی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اس کا انحصار اس کے ذاتی مزاج اور اخلاق، خاندانی ماحول اور تربیت پر بھی ہے۔ یہی حال وسیع پیمانے پر قوموں کی زندگی کا ہے۔ یونانی ریاستوں کو ۷۵۰ قبل مسیح سے لیکر ۳۲۵ قبل مسیح تک کثرت آبادی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب یہ دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو مختلف ریاستوں نے اس پیچیدگی کو مختلف طریقوں سے سلجھایا بعض ریاستوں نے اپنی زاید آبادی کو سمندر پار زمینوں پر دھکیل دیا

دوسروں نے اپنے پڑوسی یونانیوں کی زمینوں پر ہی قبضہ جمالیا تیسرے نے زرعی پیداوار کی برآمد کو حکومت کی تحویل میں دے کر اس مسئلے کو حل کر لیا۔[۱] ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ کسی دور کے افراد یا اقوام کے خیالات میں یک رنگی کا پایا جانا قریب قریب ناممکنات میں سے ہے اور چشم فلک نے آج تک آب و گل کی دنیا میں اس خواب کو کبھی شرمندہ تعبیر ہوتے نہیں دیکھا۔ مارکس اور اس کے متبعین دوراز کار دلائل لا کر بھی اپنے اس دعوے کی تصدیق ۔ جسے تصدیق کہا جا سکے۔ نہیں کر سکے اور آج تک تاویلات کی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ وطن کی محبت، قومی روایات سے وابستگی۔ ایک ہی نسل و قوم ہونے کا احساس اور کسی دین و مذہب پر ایمان معاشی محرکات سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئے۔ چنانچہ الیگزینڈر گرے نے تاریخ کی مادی تعبیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"انسان صرف اپنے پیٹ کے بل پر نہیں چلتا۔ بلکہ ہر قسم کے انسانی روابط اور سماجی تعلقات اور احساسات اس کو سرگرم عمل رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن پر معاشی حالات کوئی اثر نہیں ڈالتے ۔ بلکہ بعض اوقات وہ معاشی ماحول پر پوری شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن کا دل سے نہایت

A study of History by Toynbee, Alexander Cyrey.

ہی گہرا رابطہ ہے۔ مگر اس کی کوئی معاشی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ فرض کیجئے کہ ہم یہ سمجھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ڈینٹے، کالون، مارکس، لائڈ جارج اور جارج رگبی کو کن معاشی حالات نے جنم دیا مگر اس معمہ کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں کہ آخر انھوں نے اس دنیا میں جنم ہی کیوں لیا؟ تاریخ کی تعبیر میں ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ اس کی تعبیر میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جن میں معاشی عمل صرف ایک ہے اور ضروری نہیں کہ یہ سب سے اہم ہو۔[1]

کارخانۂ حیات میں معاشیات کی اہمیت کی نفی نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے اس کی جسارت کر سکتا ہے ہمیں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف یہ ہے کہ تہذیب و تمدن میں جو کچھ موجود ہے وہ صرف معاشیات کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ اس میں دوسرے عوامل بھی اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ معاشی انسان کو جسم اور روح کے رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے روٹی درکار ہے۔ گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے، سر چھپانے کے لئے وہ مکان کا محتاج ہے۔ بیماری کی حالت میں ایک معالج کا دست نگر ہے۔ مگر اس کی یہ ضروریات اور ان کے پورا کرنے کے طریقے اُن کے ذہن و شعور کی حالت کو تخلیق نہیں کرتے۔ جس طرح کہ ایک مصور کو تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے لامحالہ انھی رنگوں پر انحصار

لے[1] The Development of Economic Doctrine.

کرنا پڑتا ہے جو اس کے پاس موجود ہوں مگر اس سے کبھی یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس مصور کے رنگ[1] ہی اس کی تصویر کے حقیقی خالق ہیں تصویر سب سے پہلے مصور کے ذہن میں بنتی ہے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کے خدوخال باہر کی دنیا سے لیتا ہے مگر ان کی ترتیب ان کا ذہن ہی دیتا ہے اور اس تصویر کو وہ پھر قرطاس پر لاتا ہے اور اپنے ذوق کے مطابق اس میں رنگ بھرتا ہے۔ یہ تصویر مصور کی تخلیقی ذہانت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔
یہی حال ہماری زندگی کا ہے ہمیں بہر حال اسی آب و گل کی دنیا کے مادی وسائل سے اپنے لئے سامان معیشت مہیا کرنا ہے۔ مگر اس سے کبھی یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہمارا معاشی ماحول ہی ہماری ذہنی تخلیق کرتا ہے اور اس کے بدل جانے سے ہمارے سیاسی تصورات اور اخلاقی معیار بھی بدل جاتے ہیں بلکہ انسان کے اندر تو یہ جذبہ ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ کائنات کی تسخیر کرے اور اس کے

لہ یہ مثال R. M. MacIver نے اپنی کتاب Society کے صفحہ ۵۶۴ پر درج کی ہے

اسی قسم کی ایک اور مثال کارل فیڈرن نے دی ہے:۔ پیدائشی قوتیں اور حالات پیداوار یقیناً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح کہ نئے اسلحہ کی ایجاد طریق جنگ کو متاثر کرتی ہے لیکن کوئی کند ذہن سے کند ذہن بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتا کہ جنگ کے شعلوں کے بھڑکنے میں سب سے بڑا محرک اسلحہ کی ترقی اور فوجی تنظیم کی وسعت ہے اور فوجی تاریخ کے ارتقاء میں یہ اسباب ہی اصلی محرک ہیں۔

وسائل کو اس طرح اپنے استعمال میں لائے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ انسانی ذہن جہاں ایک طرف مادی ماحول کی حد بندیوں کے اندر سوچنے پر مجبور ہوتا ہے وہاں وہ مادی ماحول کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے میں جو منصوبہ بندی کرتا ہے اس میں اس کا ذہن ایک فعال طاقت کی حیثیت سے کام کرتا ہے مادی ماحول اس کی ذہنی حالت کو جنم نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا ذہن مادی ماحول کی عمارت کا نقشہ بناتا ہے۔ اور پھر اس نقشہ کے مطابق عمارت تعمیر کرنے کے لئے مادی وسائل بروئے کار لاتا ہے۔

ذرائع پیداوار سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی تصورات کے کبھی خالق نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ انسانی شعور ان سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے مگر ان کی مخلوق نہیں ہوسکتا یہ حقیقت اتنی صاف اور واضح ہے کہ اس کے لئے کسی منطق یا دلیل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ مارکس کے اپنے یارغار اینجل نے اس نظریہ کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے اس میں کافی ردو بدل کیا۔ وہ ذرائع پیداوار کی اثر آفرینی کا زبردست قائل ہے اور انھیں انسانی تصورات کے بنانے میں بہت بڑی قوت خیال کرتا ہے مگر وہ انھیں ان تصورات کا تنہا خالق نہیں سمجھتا۔ اس نے جوزف بلوچ کو ایک خط تحریر کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"تاریخ کی مادی تعبیر کے مطابق زندگی میں فیصلہ کن عنصر پیداوار ہے۔ اس سے زیادہ نہ مارکس نے دعوےٰ کیا نہ میں نے۔ اب اگر کوئی اس بیان کو توڑ موڑ کر یہ کہے معاشی

عنصر ہی اصل ہے تو حقیقت میں وہ ہمارے بیان کو
غلط معانی پہناتا ہے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ تاریخ کے اس نظریہ کی کمزوریاں خود بخود اس کے ماننے والوں پر واضح ہوتی گئیں۔ مگر ان کے لئے مارکس کو جھٹلانا بھی ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس فلسفہ کی تعبیر و تشریح میں مناسب تبدیلیاں کی گئیں ــــ عہد حاضر کے مشہور اشتراکی پروفیسر جی۔ ڈی۔ ایچ۔ کول (Prof. G. D, H. Cole) نے اپنی کتاب۔ مارکسزم کے معنی[1] (The Meaning of Marxism) میں کہا:

۔ سماجوں کی معاشی تنظیم میں اور سیاسی اداروں اور معاشرتی نظام میں ایک رابطۂ اتحاد دریافت کیا جا سکتا ہے اور یہ سمجھنا بھی کسی حد تک آسان ہے کہ کس طرح عہد ماضی میں سیاسی اور معاشرتی نظام معاشی حالات کے مطابق بدلتے رہے مگر اس نظریہ کو اس حد سے بڑھانا خطرناک ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سماج جو پیدائش کے طریقوں کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہوں ان کے معاشی ادارے، خاندانی نظام گروہی تعلقات، سیاسی اور مذہبی تنظیمیں یا اخلاقی تصورات بھی

---

[1] یہ کتاب اس سے پہلے ۱۹۴۳ء میں (What Marx (Really Meant) کے نام سے شائع ہوئی۔ اب اسے دوبارہ مزید اضافوں کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

ایک سے ہوں بعلم انسانیات Anthropology میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ کئی ایسے مختلف تمدن معرض وجود میں آئے جن کی معاشی وجہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ اگر ان میں کوئی باہمی مناسبت موجود ہے تو وہ صرف اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ معاشرتی اداروں پر معاشی حالات اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ سماج کی معاشی بنیاد کو اگر سب سے زیادہ اہم بھی تسلیم کیا جائے تو یہ صرف ایک جز (Factor) ہے۔"[1]

کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم شخص بھی اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی بقا کے لئے سب سے پہلے اسے قوت لایموت کا میسر آنا ضروری ہے۔ روح اور جسم کے رشتہ کو قائم کر لینے کے بعد ہی وہ اخلاقی اور سیاسی معاملات پر غور و فکر کر سکتا ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو کسی فرد کو بھی اس سے اختلاف نہ ہوتا۔ مگر مارکس کا دعویٰ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ذرائع پیداوار کو سماج کی ترتیب میں سب سے زیادہ فیصلہ کن اور مؤثر محرک سمجھتا ہے۔ بس یہی ہے مقام اختلاف!!

پھر اگر غور سے دیکھا جائے تو عملی میدان میں معاشی محرکات کی اصطلاح

---

[1] The Meaning of Marxism by G. D. H. Cole, P—57.

غیر واضح اور مبہم ہے۔ مارکس کا دعوٰے یہ ہے کہ حالات پیداوار اور پیداواری قوتوں کے مابین ایک فطری ربط پایا جاتا ہے۔ یعنی پیداواری قوتیں جس منزل پر ہوتی ہیں حالات پیداوار بھی اسی منزل پر ترقی کر جاتے ہیں پیداواری قوتوں سے مارکس وہ ایجادیں مراد لیتا ہے جو آفرینش دولت کے طریقوں کو بدل کر سماج کی معاشی تنظیم پر اثر ڈالتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی میں آخر وہ کون سے ایسے لمحات ہیں جو فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ کیا وہ وقت جب کوئی ایجاد معرض وجود میں آتی ہے۔ یا جب اس کو پہلی مرتبہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یا جب اس کا عام استعمال شروع ہو جائے۔ آخر کون سا موقع ہوتا ہے۔ جب کہ اس کا اثر سماج پر نمایاں ہونے لگے مارکس کی تحریروں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہی آخری دور تھا۔ لیکن ایک بات جو سوچنے کی ہے وہ یہ ہے کہ آخر کوئی ایجاد عام کس طرح ہوتی ہے۔ دنیا کے سارے مارکسی اس بات پر متفق ہیں کہ ایک ایجاد کو عام کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حالات پیداوار میں ایک خاص معیار تک ترقی کے ساتھ ساتھ اس کام کے جاننے والوں یا ذہین اشخاص کی کافی تعداد ایسی ہونی چاہیئے جو اس کام کو جلد از جلد سیکھ سکیں اس حقیقت کے تسلیم کر لینے سے مارکسی فلسفہ خود بخود غلط ہو جاتا ہے اس نقطۂ نظر سے جب ہم حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حالاتِ پیداوار کا انحصار پیدائشی قوتوں کی ترقی پر نہیں بلکہ پیدائشی قوتوں کا تعین حالاتِ پیداوار کی ایک خاص منزل کرتی ہے۔

مارکس نے ہیگل اور شپنگلر کی طرح اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے واقعات کا بے دریغ خون کیا۔ سب سے پہلے تو اُس نے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے زمانہ قبل از تاریخ کے حالات کو پیش کیا۔ اس عہد کے متعلق کوئی چیز بھی وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ قوموں کی سماجی اور سیاسی حالت ماضی کے ایسے گہرے کُہر میں گم ہے کہ کوئی متجسس آنکھ بھی اس کو صحیح طور پر ڈھونڈ نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ وقت کی رنگینیوں نے اس کے گرد افسانہ کے اتنے رنگین پردے لپیٹ دیئے ہیں کہ حقیقت کا کھوج لگانا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ پھر سلسلہ ہائے واقعات کے اندر سے اتنی کڑیاں مفقود ہیں کہ استخراجی طریق فکر کے مضبوط سے مضبوط درمیانی حلقے بھی اس خلا کو پورا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ایک مفکر کے لئے اس دور کے واقعات کو لے کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔ بلکہ قریب قریب محال ہے۔ مارکس اور اس کے رفیق کار اینجلز نے اپنے مقدمات کی اساس ان واقعات کو ٹھہرایا جو عرصہ ہوا ماضی کے دھندلکے میں چھپ چکے ہیں [1]

زمانہ قبل از تاریخ سے دلائل دینے میں ایک فائدہ ضرور ہے اور وہ یہ کہ صاحب فکر اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق ان منتشر واقعات کو جوڑ سکتا ہے مارکس

---

[1] مارکس اور اینجلز نے ان دونوں کتابوں پر اعتماد کیا۔

Lewis Morgan's Studies of the Iroquors Ludwing Von Maurer's Work on the Municipal & Agrarian customs of the Ancient Germans.

اور اس کے متبعین نے اپنے نظریات کو حق ثابت کرنے کے لئے یہی کچھ کیا انھوں نے واقعات کو نہایت بے دردی سے مسخ کر کے دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا۔ کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اس ردوبدل کی ایک نہیں بلکہ کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک حوالہ بطور مثال نقل کرتے ہیں:۔

تاریخ کے مادی نظریہ کے زبردست شارح اور مفسر کے قول کے مطابق خانہ بدوش قبائل میں عورت کا کوئی احترام نہیں تھا۔ کیونکہ گلہ بانی اور جنگ و جدال میں یہ محض عضو بیکار تھی۔ لیکن جونہی دنیا میں کھیتی باڑی کا چرچا ہوا تو معاشی ماحول کی تبدیلی سے لوگوں کا صنف نازک کے متعلق زاویہ نگاہ بھی بدل گیا اب مردوں کے دلوں میں اس کے لئے مودت اور رحمت تھی اس تغیر کی اصل وجہ مارکس کے نزدیک عورت کا معاشی نقطہ نظر سے مفید ہو جانا تھا۔ کیونکہ اب وہ زراعت میں مرد کے دوش بدوش کام کرنے لگی تھی۔

غور کیجئے کہ یہ نتیجہ کتنا غلط ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام خانہ بدوش قبائل عورت کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے عورت کی عزت و توقیر کی جاتی رہی ہے دوسرے یہ کہ ایک نہیں بیشمار قومیں ایسی ہیں جو زراعت کو اپنانے کے باوجود عورت کو عزت سے نہیں دیکھتیں افریقہ کے بہت سے قبائل میں عورت کی حیثیت عام غلام سے کسی صورت بھی بہتر نہیں۔ پرانے جرمنوں میں بھی اس کا یہی حال تھا۔

ان تاریخی حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی سوچئے کہ یہ تصور کہ چونکہ عورت

زراعت میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے باعث توقیر ہے کتنا مضحکہ خیز ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دنیا میں عزت صرف کام کی ہے۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ دُنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں عزت و احترام کا دارومدار محض "کام" پر ہو۔ عزت دنیا میں ہمیشہ زبردستوں کی رہی ہے۔ زیردست خواہ وہ غلام ہوں، عورتیں ہوں یا مزدور، ہمیشہ سے ظلم کے وار سہتے رہے۔ جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی عزت کا سبب وہ دینی تحریک ہے جس کو مختلف انبیاء خصوصاً سیدنا مسیح علیہ السلام نے اٹھایا۔ اور اس کے کمزور پڑ جانے کے بعد پھر فخر موجودات ختم الرسل محمد الرسول اللہ نے اسے عرب میں زندہ کیا۔ یہ حکم کہ[1]

• لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

عورتوں کی آزادی کا چارٹر تھا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی عورت کی کمتری اور حقارت سے متعلق وہ تمام تصورات جو قدیم مذاہب اور تہذیبوں میں پائے جاتے تھے ختم ہو گئے۔ اب عورت کوئی حقیر اور نجس وجود نہ تھی یا وہ کوئی بے عقل اور بے مقصد ہستی نہ تھی۔ اب وہ شیطان کی ایجنٹ یا گناہ کے لئے سرچشمہ کی حیثیت نہیں

---

[1] يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔

رکھی تھی بلکہ یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جس نفس واحدہ سے مرد وجود میں آیا ہے۔ اسی سے عورت کا بھی ظہور ہوا ہے۔ اور جس طرح انسانی معاشرہ کا ایک اہم رکن مرد ہے اسی طرح اس معاشرے کی دوسری اہم رکن عورت ہے۔ اس معاشرے کا وجود اس کی بقا اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے کہ ساری اہمیت بس اسی کو دے دی جائے اور نہ یہ بات کہ ان میں سے کسی ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم دی جائے بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ تخیل کی کوئی بڑی سے بڑی زقند بھی عورت کے متعلق مارکس کے اس نظریہ کو درست ثابت نہیں کرسکتی۔

— ممکن ہے مارکسی حضرات یہ دعوے کریں کہ اسلام بذات خود اس دور کے معاشی حالات کی پیداوار تھا۔ اور اس نے جن افکار و خیالات کی اشاعت کی وہ سب اس دور کے معاشی تقاضے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر دنیا کے مختلف مذاہب صرف معاشی ماحول کے پرتو ہیں تو ایک دور کے مذاہب میں بھی بہت حد تک ہم رنگی ہونی چاہیئے۔ ان کی تعلیمات کا بھی قریب قریب ایک ہی محور ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن تاریخ اس کی تردید کرتی ہے مارکس نے تاریخ انسانی کو ۔ ۔ ادوار میں منقسم کیا ہے۔ اس کے مطابق رومی اور دور اوّل کے مسلمان جس معاشی ماحول میں رہتے تھے وہ ایک تھا۔ یعنی غلامی کی ملکیت کا دور۔ اس لحاظ سے پیدائش دولت کے طریقے میں کافی حد تک یکسانیت تھی۔ اور تقسیم دولت کا طریق بھی قریب قریب ایک جیسا تھا۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق دونوں اقوام کو اخلاق کی بھی ایک ہی سطح پر ہونا چاہیئے

تھا۔لیکن تاریخ کے واقعات اس کے ہمنوا نہیں ۔تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ مسلمانوں کے اخلاق رومیوں سے بہت مختلف تھے ۔مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ رومیوں اور مسلمانوں کا اپنے غلاموں کے ساتھ کیا سلوک تھا ۔اگرچہ غلامی دونوں قوموں میں جائز تھی لیکن اس کے باوجود ان کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا ۔اسلام نے اخلاقی تربیت اور قانونی مشینری کو کام میں لاکر غلاموں پر ظلم و استبداد کرنے کے سب راستوں کو مسدود کر دیا ۔ان کو حیوانیت کے پست درجے سے اٹھا کر انسانیت کے زمرے میں داخل کیا۔ اہل اسلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے غلاموں کو بھی وہی غذائیں کھلائیں جو خود کھاتے ہیں اور وہی پہنائیں جو خود پہنتے ہیں۔اور ان سے ایسا کام نہ لیں جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ اور نبی آخرالزماں کو اس کی اتنی فکر تھی کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے آخری وصیت جو فرمائی وہ الصلوٰۃ ! الصلوٰۃ !! وما ملکت ایمانکم !!! یعنی نماز اور لونڈی غلام کے حقوق تھے ۔اس کے برعکس اسی معاشی دور میں رومیوں نے غلاموں کو ستم کے ایسے سخت شکنجوں میں کس رکھا تھا جن کی یاد سے آج بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے ۔سماج کی ایک نہج پر معاشی ساخت میں، ایک ہی طرح کے طریق پیداواری کے استعمال میں اور ایک ہی قسم کے ملکیتی تعلقات کی حدود میں رہتے ہوئے اس عظیم اختلاف کی وجہ کوئی معمولی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے اسباب اور تھے۔ دونوں قوموں کے آدرش ر (Ideal) میں فرق تھا جن کے حاصل کرنے کیلئے دونوں

جد وجہد کر رہی تھیں اور دونوں کی جد وجہد کے راستے بھی بالکل الگ تھے۔
ہر قوم اور ہر فرد کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جو نصب العین چاہے اختیار کرلے۔ اور جس راہ پر چاہے گامزن ہو۔ دنیا میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ مختلف افراد اور اقوام نے ایک سے معاشی حالت میں رہ کر بھی زندگی کی مختلف راہیں اختیار کیں۔ اگر امراء صرف اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے زندہ ہیں تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اشتراکیت کے اولین داعی، مزدوروں کی تحریک کے بڑے بڑے سرگرم کارکن سب کے سب اونچے طبقے سے چھٹ کر آئے۔ معاشی ماحول کی اثر آفرینیوں کو فی الحال جانے دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض اوقات ایک ہی گھر میں پرورش پانے والے اور ایک ہی معلم کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے والے بچے متضاد رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مستثنیات ہیں۔ مگر ان مستثنیات کی اتنی مثالیں ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان کے موجود ہوتے ہوئے تاریخ کے متعلق کوئی عالمگیر نظریہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ کارل فیڈرن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"یہ مستثنیات ہی انسانی ترقی اور ارتقاء میں سب سے زیادہ اہم ہیں اگر آئیڈیالوجی صرف ماحول ہی کی پیداوار ہے تو سارے انسانوں کے جو ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں ان کے خیالات و مقاصد بھی لامحالہ ایک ہی ہونے چاہئیں۔ اور ان حالات کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی طبقہ سے ایک ہی طرح کے

لوگوں سے، ایک ہی خاندان کے افراد میں سے، بہنوں اور بھائیوں کے پہلو بہ پہلو زبردست انقلابی مفکرین پیدا ہوں [1]"

"انسان بلاشبہ ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر اس کے اثر کی نوعیت کا تعین مشکل ہے۔ ماحول کے فرد پر اثرات کا زیادہ انحصار فرد کی شخصیت پر ہوتا ہے مختلف انسان ایک ہی قسم کے واقعات سے مختلف قسم کے اثرات قبول کرتے ہیں بعض لوگوں پر معمولی حادثات کا زبردست ردّعمل ہوتا ہے۔ اور بعض پر اسی قسم کے حالات خفیف سے خفیف اثر بھی نہیں ڈالتے [2]

ایسے انسانوں کا وجود جنھوں نے اپنی نسل کو نئے نئے خیالات بخشے جنھوں نے نہایت نازک حالات میں قوم کی رہنمائی کی۔ اس وقت کے معاشی حالات کا رہینِ منت نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ یہ پیداواری قوتوں کی ترقی کا نتیجہ ہے یا معاشی ماحول کا تقاضہ کہ کانٹ، نیوٹن، روسیو، گوئٹے اور نپولین پیدا ہوئے جن کا اثر اقطاعِ عالم میں مدتوں رہا۔ تو اس شخص کو یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ ان لوگوں کی ایک خاص وقت میں پیدائش کی کیا وجہ تھی یہ ثابت کئے بغیر مارکس کی مادی تعبیر درست نہیں ہو سکتی۔

---

[1] The Materialist Conception of History by Karl Federn (page 77)

[2] Ibid (page 78)

اسلام کا فلسفۂ تاریخ

پچھلے مبحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ مغربی مفکرین فکر و نظر کے باہمی اختلافات کے باوجود جس معاملہ میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں وہ یہ کہ ان کے نزدیک اصل حقیقت صرف اجتماعیت ہے۔ انفرادیت اُن کے خیال میں محض ایک سراب ہے اسی نظریہ کی بنیاد پر انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سماج ایک نامیہ (Organism) ہے جس میں فرد ایک خلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بیچارا اسی رُخ پر چل سکتا ہے جس طرف اجتماعیت اسے اجازت دے۔ اس کا اپنا الگ کوئی وجود نہیں بشپنگر نے اسی نظریہ کو پیش کیا۔ ہیگل (Hegel) نے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یہی کچھ کہا۔ اس کے نزدیک زندگی کی یہ ساری کشمکش اور پیکار روح مطلق ہی کے مظاہر ہیں۔ انسان اس ساری کشمکش میں محض ایک آلہ کار کی

حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کے عزائم، اس کی ضروریات، اس کے افکار غرضیکہ اس کی پوری زندگی کی تشکیل اور صورت بندی روح مطلق خود اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے کرتی ہے انسان اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ آزاد ہے اور جو کچھ کر رہا ہے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ انسان کی زندگی روحِ عالم (World Spirit) کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے محض ایک کٹھ پتلی جسے وہ جدھر چاہتی ہے گھما دیتی ہے۔ نہ اس کے افکار اپنے ہیں نہ نظریات و مقاصد اپنے۔

یہی حال مارکس کا ہے۔ وہ انسان کو بندہ مجبور سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان حالات کی پیداوار ہے اور ان حالات کے بنانے میں اصل اور فیصلہ کن قوت معاشی ہے۔ انسان منفعلانہ طور پر معاشی محرکات کے اشارے پر چل رہا ہے۔ یہ محرکات جس رُخ پر چاہتے ہیں اسے لے جاتے ہیں جس سانچے میں چاہیں اسے ڈھال دیتے ہیں اور جن مقاصد کے لئے چاہیں اسے استعمال کر لیتے ہیں۔ وہ خود بھی کچھ نہیں۔ اسلام انسان کے متعلق اس نظریہ کا سخت مخالف ہے وہ انسان کو خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ	اور جس وقت آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں ایک نائب بناؤں گا تو فرشتے کہنے لگے کہ کیا آپ اس زمین میں ایسے لوگوں کو مقرر کریں گے جو یہاں فساد اور

وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔	خونریزیاں کریں گے۔ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔
(۲:۴)	
وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ۔ فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُۥ سٰجِدِينَ	اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لئے سربسجود ہو جانا
(۱۵:۳)	

اس مضمون کو قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم عطا کیا اور اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے نائب کو سجدہ کرو۔ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا۔ اور اس طرح شیطانی قوتیں اس کے آگے نہ جھکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر سا پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اسے نیابت خداوندی کا اہل بنا دیا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں اسلام اور مغربی فلسفہ کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ مغربی فلسفہ کی رُو سے انسان ایک حیوانِ ناطق ہے مگر اسلام میں وہ نائب خدا ہے۔ خالق کائنات نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ صرف اسی کی ذات کے لئے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔ (۷:۱۷)	ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں۔ ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ۔ (۹:۲۲)	اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا۔ کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمھارے لئے مطیع بنا دیا۔

• اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمھارے لئے سردی سے حفاظت کا سامان ہے۔ اور منفعتیں ہیں۔ اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو ان میں تمھارے لئے ایک شان جمال ہے جب کہ صبح تم انکو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو وہ تمھارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمھارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے گھوڑے اور خچر اور گدھے تمھاری سواری کیلئے

ہیں۔ اور سامانِ زینت ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے۔
جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا
اس میں سے کچھ تمھارے پینے کے لئے ہے۔ اور کچھ درختوں کی پرورش
کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو
اس پانی سے خدا تمھارے لئے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح
طرح کے پھل اگاتا ہے۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں
کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمھارے لئے رات
اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کئے ہیں۔ یہ سب اسی
خدا کے حکم سے مسخر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو
عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں
جو اس نے زمین میں تمھارے لئے پیدا کی ہیں۔ ان میں سبق
حاصل کرنے والوں کے لئے بڑی نشانی ہے اور وہ خدا ہی ہے جس
نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی نکال کر) کھاؤ
اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے
کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں
چنانچہ سمندر کو اس لئے بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل
تلاش کرو۔ (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اس نے
زمین میں پہاڑ جما دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے
اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزلِ مقصود کی راہ

پاؤ اور بہت سی علامات بنائیں منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے
لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان
کو بے حساب پاؤ گے (۱۶: ۱۰۲)

ان آیات میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت اور فائدے کے لئے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی ہے۔ یہ درخت، یہ سورج، یہ ستارے غرض یہ سب چیزیں جنھیں تو دیکھ رہا ہے۔ تیری خادم ہیں۔ تیری منفعت کے لئے ہیں اور تیرے لئے ان کو کار آمد بنایا گیا ہے۔ تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے۔ لہٰذا تو اپنے ان خدام سے کام لے۔ مگر ایک غیر ذمہ دار اور غیر مسئول حاکم کی طرح نہیں بلکہ نیابت کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے۔ تیری نیابت جہاں تجھ کو فضیلت عطا کرتی ہے وہاں تجھ پر بہت سی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے جن سے اچھی طرح عہدہ برا ہو کر ہی تو نیابت کا صحیح معنوں میں مستحق ہو سکتا ہے بحیثیت نائب کے تیرا یہ فرض ہے کہ تو جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے اگر تو ایسا نہیں کرتا ہے تو تو باغی ہے اور اس کا مجاز نہیں ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت اپنا نوکر، اپنا خادم اور اپنا غلام بنا لے۔ اگر تو ایسا کرے گا تب بھی تو باغی قرار دیا جائے گا اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہوگا۔ تجھ کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے۔ وہاں تو اپنے آقا کی املاک میں تصرف کر سکتا ہے۔ ان سے خدمت لے سکتا ہے۔ ان کی نگرانی کر

سکتا ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ تو خود آقا ہے اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا تو کسی اور کا ماتحت ہے۔" بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ تو اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں۔ ان پر اپنے آقا کا امین ہے:۔ اس بنا پر تو سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے، اس کی املاک، اس کی رعیت، اس کے نوکروں، اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرے، ان سے خدمت لینے، ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے قوانین پر کاربند ہو اگر تو ایسا نہ کرے تو تو نائب نہیں باغی ہوگا۔ پسندیدہ نہیں مردود ہوگا مستحق انعام نہیں مستوجب سزا ہوگا۔

اس ضمن میں ایک اور ضروری بات جو توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق کوئی مخصوص فرد یا گروہ نائب خدا نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کو یہ فضیلت عطا کی گئی ہے اور دنیا کا ہر فرد خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کے برابر ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے جس چیز کا مطالبہ کر سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اس کی ہدایت کی پیروی کرے۔ اس معاملہ میں پیروی کرنے والا، اطاعت کیش اور پیروی نہ کرنے والا باغی اور سرکش ہے۔ کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا ہے وہ حق نیابت نہ ادا کرنے والے سے بہتر ہے مگر فضیلت کے یہ معنی نہیں کہ وہ خود اس کا آقا ہے۔

دوسرے نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے اس میں کوئی مشترک ذمہ داری نہیں۔ اس لئے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہ ہے۔ یہاں ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانا ہے اس معاملہ میں نہ زید کے عمل کی ذمہ داری بکر پر عاید ہوتی ہے نہ ایک کو دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتا ہے اور نہ کسی کی غلط روی کا وبال دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ اور لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت کہہ کر ہر فرد بشر کو کلیتہً اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص پاک بازی کی زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا۔ (وَمن تزکّیٰ فانّما یتزکّیٰ لنفسہٖ) اگر کوئی محنت اور مشقت کرے گا۔ تو اس کا فائدہ بھی خود اسی کو حاصل ہوگا (مَنْ جاھَدَ فانّما یُجاھِدُ لِنفسِہٖ) اور اگر کوئی نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کی اپنی ہی فلاح ہے (اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنفُسِکُمْ وَ اِنْ اَساتم فلَھا) جس کسی نے اپنی زندگی میں ذرہ بھر بھلائی کی تو وہ اس کا پھل پائے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی تو وہ بھی اس کا نتیجہ دیکھ لے گا — فَمَنْ یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ خَیراً یَرَہٗ وَمَنْ یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرَہٗ۔

یہ ذمہ داری کا منصب ظاہر بات ہے کہ کسی بندۂ مجبور کو نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایک فرد اس فرض کی بجا آوری کے لئے مجبور ہی ہے تو اس میں انسانیت کا کمال کیا ہے۔ اس بار امانت کے حامل اور اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت جس کی بنا پر یہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے یہ ہے کہ اسے طبعًا اطاعت کیش نہیں بنایا گیا بلکہ اسے عمل کی قوت عطا کر دی گئی ہے جس سے کام لے کر وہ غلط راستہ پر بھی جا سکتا ہے اور صحیح پر بھی۔ خداوند تعالےٰ کے نظامِ کلی کے تحت قوانین وحدودِ الٰہیہ کا پابند ہونے کے باوجود ایک خاص دائرہ میں مجبورانہ اطاعت سے آزاد ہے۔ اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی ونافرمانی کرنے لگے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (النساء ۲)	اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیگا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کریگا اسے دوزخ میں ڈال دیا جائیگا۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔

یہ اور ایسی ہی بے شمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں بخلاف دوسری مخلوق کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے اور اس قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ فوز یا خسران، ثواب یا عقاب انعام یا غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

اگر انسان سے یہ آزادی عمل سلب کر لی جائے تو اخلاق کا سارا فلسفہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں اور ایک مشین میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور انسان کی پوری مذہبی اور اخلاقی زندگی ایک کھیل تماشہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن پاک کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ خالق کائنات جس نے ہمیں اس دنیا میں پیدا کیا ہے ہمیں علم دیا ہے۔ غور و فکر اور ارادے اور فیصلے کی قوتیں عطا کی ہیں جس نے ہمیں نیک و بد میں تمیز کرنے کا احساس بخشا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ مذاق کے طور پر نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس کارساز نے ہمیں بھلائی اور برائی کے درمیان فرق کرنا سکھایا ہے اس نے ہمیں محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات بھی دے رکھے ہیں۔ اور ان اختیارات کے استعمال میں ہمیں مناسب حد تک آزادی بھی دی گئی ہے اور پھر اس کے بعد ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہم از خود جادۂ مستقیم پر گامزن ہوں۔ چنانچہ اس دور کے ایک بڑے مفکر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب "اسلامی الہیات کی جدید تشکیل" میں لکھا ہے:۔

"جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کے اس ابتدائی

دورسے عبارت ہے جبکہ اس میں احساسِ خودی پیدا نہ ہوا تھا اور اس نے اپنے ارادے اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ (یعنی آدم کا جنت سے نکلنا) دراصل اس حقیقت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلی میلانات کے دائرہ سے باہر قدم نکالا اور ایک آزادانہ با اختیار الیغو کا مالک بنا۔ اس میں آگہی، وقوف، شک اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ آغوشِ فطرت میں طویل خواب کے بعد اب وہ بیدار ہوا اور اس کو پہلی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ واقعات و حوادث کے اسباب اس کی ذات میں پنہاں ہیں۔ آدم کی نافرمانی اس کے لئے ایک سبق تھی۔ اس طرح اس نے اپنے اختیار و ارادہ کو برتنا سیکھا۔ اسی لئے اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔"

(روحِ اقبال از یوسف حسین خان)

یہ ارادہ و اختیار جس طرح ایک فرد کو ملا ہے اسی طرح قوموں کے حصہ میں بھی آیا ہے۔ قومیں اور جماعتیں بیجان مادے کے برعکس، جو سالقہ علتوں کے اثرات کو خود بدل نہیں سکتا۔ اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کر کے دنیا میں کامیاب و کامران ہو سکتی ہیں۔ افراد کی طرح قوموں اور جماعتوں کے حالات قانونِ علت و معلول کی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن پاک نے بڑی صراحت سے فرمایا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳ : ۲)	اللہ تعالےٰ کسی قوم کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس کے افراد اپنے آپ کو نہ بدلیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی تقدیر کو بدلنے کا ارادہ کرے تو اسے ایسا کرنے پر اختیار ہے۔ خداوند تعالےٰ اس کی اس معاملہ میں معاونت فرماتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسلام انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کے تصوّر کو باطل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک جنت سے نکلا ہوا انسان پیدائشی مجرم نہیں۔ وہ افرادِ انسانی کو فطرۃ اللہ پر مخلوق قرار دیتا ہے۔ اور ان کے ذہنی اور بدنی قویٰ کے متعلق یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ اگرچہ بھلائی اور برائی کے دوگونہ رجحانات کے زیرِ اثر آ سکتے ہیں لیکن وہ فی الجملہ انسان کو خیر کی طرف زیادہ آسانی سے مائل کرنے والا تسلیم کرتا ہے۔ انسان کی فطرت سے اسے کوئی مایوسی نہیں۔

یہی وہ فرق ہے جو اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ مسیحی تصور کے مطابق دنیا سراپا گناہ ہے۔ خواہشات نفسانی اور احساس خودی دراصل آدم کی لغزش کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُسے جنت سے نکالا گیا۔ اسی بنا پر عیسائیوں کے ہاں اس خیال کا عام چرچا ہو رہا ہے۔ کہ اگرچہ اس کائنات کا خالق خداوند تعالیٰ ہی ہے مگر اس کو تخلیق کرنے کے بعد اسکے نظم و نسق کو چلانے کی غرض سے اسے شیطان کے حوالہ کر دیا گیا تاکہ جس طرح

چاہے وہ اس سرزمین میں فسق وفجور پھیلاتا پھرے۔ اور اس معاملہ میں اس کی راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ اس تعلیم کی رُو سے انسان فطرۃً ذلیل و حقیر ہے اور اس وجہ سے وہ کسی ذمہ داری کا اہل نہیں ہو سکتا۔ آدم کے جنت سے نکلنے اور دنیا میں آنے کے متعلق مسیحی اور اسلامی تعلیمات میں جو فرق ہے۔ وہ دراصل زندگی کے اس نقطۂ نظر پر مبنی ہے جو ان مذہبوں نے اپنے پیرؤوں کے لئے پیش کیا۔

قریب قریب یہی یا اس سے کچھ بڑھ کر حال بدھ مت اور ہندو مت کا ہے۔ ان دونوں نے بھی زندگی کی خواہشات کو کچلنے اور اپنے وجود کے فنا کرنے میں انسانی عظمت کا راز سمجھا ہے۔ اس کے برعکس قرآن نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق انسان کی سعادت و فلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ وہ تمام صلاحیتوں کو کام میں لا کر اپنی خودی کو ہدایت الٰہی کے مطابق مستحکم کرے۔ اسلام جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ انفرادی ذمہ داری اور سعی و عمل کو زندگی کا اصل الاصول قرار دیتا ہے جس سے اس کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے اگر وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اگر وہ فسق و فجور کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ کسی قدرتی دباؤ کے تحت نہیں اور نہ وہ پیدائشی گناہگار ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ قرآن کی رو سے وہ نیکی پر پیدا کیا گیا ہے اب اگر وہ فضیلت کے اعلیٰ معیار سے گرتا ہے اور اس مقام محمود کو چھوڑتا ہے جو خالق کائنات نے اُسے بخشا ہے تو یہ اس کی اپنی ہی سیہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ہ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ہ

ہم نے بنایا آدمی کو بہترین اندازہ پر پھر ہم اسے پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں۔ مگر جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کئے یہ ان کے لئے بے انتہا اجر ہے۔

قرآن حکیم اس دنیا کو دارالعذاب نہیں سمجھتا بلکہ اسے آزمائش گاہ خیال کرتا ہے جس میں آکر انسان کو اپنی صلاحیتوں کے ابھارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے۔ تو پھر اس کے لئے بھلائی ہی بھلائی ہے اور اگر وہ اس میں ناکام ہوتا ہے تو دنیا اور آخرت دونوں میں اسے رسوا ہونا پڑتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اسے نیابت عطا کرنے کے بعد یہ بتایا ہے۔ کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ ہ

(۶:۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔

• قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی

(موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا) قریب ہے کہ خدا تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمھیں

الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ .. (۱۵:۷)	زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔
يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔ (۳۸ : ۲۱)	اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ یہ تجھے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی ۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک چکے ہیں ان کے لئے اس بنا پر عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول چکے ہیں ۔

یہ آیات اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ خداوند تعالےٰ نے ہمیں اپنی خلافت سے اس لئے نوازا ہے کہ ہم اس آزمائش میں پورے اتریں ظاہر بات ہے کہ جب خدا نے ہمیں اس امتحان گاہ میں اتارا ہے تو اس نے ہماری کامیابی اور ناکامی کا ایک معیار بھی ضرور رکھا ہے جس پر جانچ کر وہ بعض کو کامیاب اور بعض کو ناکام کرتا ہے اس کی مشیت کوئی اندھی بہری قوت نہیں جس کا کوئی اصول اور ضابطہ ہی نہ ہو۔ وہ جب کسی قوم کو دنیا میں سربلند کرتا ہے تو اس میں ایسی خوبیاں ضرور پائی جاتی جو اسے اس کا مستحق ٹھہراتی ہیں ۔ اور جب کسی قوم کو پستی کی طرف دھکیلتا ہے تو اس میں ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے عروج

کے مقام پر رہنے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ خداوند تعالےٰ از خود کسی قوم سے اپنی عطا کردہ عنایات واپس نہیں لیتے۔ وہ اس وقت ان نوازشوں کو چھینتے ہیں جب قوم اپنی بدکرداری سے یہ ثابت کردیتی ہے کہ وہ ان کی اہل نہیں۔

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۸:۷)	اللہ تعالےٰ کسی قوم سے اپنی عطا کردہ نعمتیں واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ قوم اپنے عمل اور کردار سے خود نہیں بدلتی۔

آیئے اب ہم ایک نظر انسان پر بھی ڈال لیں۔

اس کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے اندر دو مختلف حیثیتیں رکھتا ہے جو اپنی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں مگر باہم دگر ملی جلی بھی۔

ایک حیثیت سے وہ ایک حیوان ہے اور اس وجہ سے اس پر وہی قوانین فرمانروائی کر رہے ہیں۔ جو تمام طبیعیات و حیوانات پر نافذ ہوتے ہیں اس لئے انسان کے وجود کی کارکردگی منحصر ہے اُن آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر اور اُن طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبیعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے یہ پیکر انسانی جو کچھ کرسکتا ہے انھیں قوانین طبیعی کی پابندی کے ذریعہ آلات و وسائل کی مدد سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کرسکتا ہے۔ اور اسکے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

اس کی دوسری حیثیت جس کی وجہ سے اُسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ اس کی حیوانی حیثیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقی حیثیت ہے اور اس حیثیت سے وہ طبیعیات کا تابع نہیں بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے اور اپنے طبعی اور حیوانی وجود کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اندر ان دونوں قوتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کے حیوانی داعیات ہیں اور دوسری طرف اخلاقی احساسات۔ مجموعی حیثیت سے اس کی کامیابی کا راز مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کی مدد سے۔ اور اگر وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے چھن جاتی ہیں۔ یا اس میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے لیکن اگر حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوموں کے عروج و زوال میں اصل اور فیصلہ کن قوت صرف اخلاقی قوت ہے۔ باقی رہے مادی وسائل اور اسباب، تو اُن کی حیثیت آلۂ کار کی سی ہے۔ انسانی عظمت صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ چند دھاتوں کا مجموعہ ہے یا اس میں چلنے پھرنے کی قوتیں موجود ہیں۔ بلکہ اس کی وہ امتیازی خصوصیت جس کی وجہ سے اسے خلیفہ منتخب کیا گیا ہے اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ لہٰذا جب انسانیت کا جوہر صرف اخلاق ہی ہے تو لامحالہ انسانیت کی ترقی اور تنزل میں اخلاقیات کو ہی انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے[1]۔ اس لئے اگر اسلامی فلسفۂ تاریخ کو

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی کتاب ؟

تاریخ کی اخلاقی تعبیر کا نام دے دیا جائے تو یہ غیر موزوں نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں ہم ایک اور ضروری بات جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مغربی اقوام کی ہوش ربا مادّی ترقی نے بعض ذہنوں کو یہاں تک متاثر کیا ہے کہ ان کی نظر سے قانون طبیعی (Physical Law) اور قانون شرعی (Moral Law) کا فرق یکسر اوجھل ہوگیا ہے۔ ان کے نزدیک عبادتِ الٰہی محض قانون طبعی کی پیروی کا نام ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ قانون شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ ان لوگوں کو بھی خدا کے عبادت گزار بندے قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبیعی کو کام میں لا کر ایجادات و اکتشافات کے میدانوں میں دنیا کی دوسری اقوام سے آگے نکل جائیں۔ اگرچہ وہ ان کے استعمال میں خداوند تعالیٰ کے قانون اخلاق کے بالکل پابند نہ ہوں۔ اسی قسم کا ایک نظریہ ایک بزرگ نے یوں پیش کیا ہے۔

"آج دنیا میں وہی قوم بلندی، آزادی اور عزت حاصل کر سکتی ہے جو صحیح معنوں میں فیض رساں اور خادم خلق ہو جو مخازن اور معادن کو استعمال میں لا کر رفاہ عامہ کے لئے گاڑیاں چلائے دریاؤں پر پل باندھے۔ نہروں اور سڑکوں کا جال بچھائے سمندر کی طغیانیاں مسخر کر کے انھیں تجارت کے قابل بنائے جن کی تلاش و جستجو سے ایک عالم فائدہ اٹھائے۔ جو آبشاروں سے بجلی پیدا کر کے دنیا کو روشنی اور طاقت عطا کرے۔ جو کوئلے اور

پٹرول کا صحیح استعمال جانتی ہو اور جس کے فولادی اسلحہ اعدائے
انسانیت کے لئے تباہی و ہلاکت کا پیام ہوں۔"

اس کے بعد امر بالمعروف کی تشریح فرماتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"قرآن میں ہمیں امر بالمعروف کا لقب دیا گیا ہے معروف یہی
ہے کہ ہم کائنات کے اسلحہ خانہ سے قوت و ہیبت کا وہ سامان
پیدا کریں کہ شیطان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو جائے۔"

قرآنِ پاک کی یہ تفسیر اس کی حقیقی روح کے یکسر منافی ہے۔ اس کے
تو دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان کو یہ بتائے کہ وہ "اندر کے حیوان"
پر کس طرح غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگر قرآنِ حکیم کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ انسانوں
کو ہوائی جہاز اور بم بنانے کی تلقین کرے۔ تو اس لحاظ سے مغربی اقوام مسلمانوں
کی بہ نسبت زیادہ مومن اور صالح ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا ایسے گمراہ کن
نظریات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کو محض قانون طبیعی کی
پیروی کے لئے پیدا کیا جاتا تو پھر کسی نبی اور کسی کتاب کی ضرورت نہ تھی۔
اس کے لئے صرف حیوانی جبلت ہی کافی تھی۔ جو ساری زندگی میں اس
کی رہنمائی کرتی جس طرح ایک بھیڑیے کا بکریوں کو کھا جانا عین قانون
طبیعی کی پیروی۔ اسی طرح ظالم اقوام یا جماعتوں کا کمزوروں پر ظلم وستم
ڈھانا بھی عین فطرت ہے۔ اس بنا پر ہر قسم کا جور و جفا اور لوٹ کھسوٹ
نہ صرف جائز ہے بلکہ عین انصاف ہے۔ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد
انسان اور موذی جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا انسانیت

نے آج تک جو لڑائی حق اور انصاف کے لئے لڑی ہے وہ سب بیکار اور غلط ہے۔ اسلام اس فلسفہ کی پورے زور سے تردید کرتا ہے۔ اس کی تو بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کو قانون شرعی کے مطابق ڈھالا جائے اور اسے اخلاق کی ان معروضی قدروں (Objective Values) کا پابند بنایا جائے جو خداوند تعالے نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے اہل دنیا تک پہنچائیں۔

پھر اس نظریہ کے حامی ایک ضروری بات بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر عروج نام ہی مادی غلبہ کا ہے اور زوال مادی اسباب کی کمی ہے تو اس لحاظ سے یہ کہنا کہ مادی طاقت عروج کا باعث ہوتی ہے یکسر غلط ہے۔ اس میں ایک فکری تضاد پایا جاتا ہے۔ اس دعوے کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ کسی قوم کا مادی غلبہ اس کے مادی غلبہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ استدلال نہایت ہی مہمل اور بے معنی ہے۔

بالفرض اگر چند لمحوں کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کسی قوم کی ترقی کرتے رہنے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ مادی اعتبار سے مضبوط ہو اور اس کے ذلیل وخوار رہنے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ بے سروسامان ہو تو پھر آج تک کی ساری تاریخ غلط ہو جاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر ایک قوم کو دنیا میں ترقی حاصل ہو جائے تو پھر اسے اسی مقام پر رہنا چاہیئے کیونکہ اس مادی طاقت کی وجہ سے وہ مزید دولت سمیٹ سکتی ہے اور دوسری قوموں کو ہمیشہ کے لئے مغلوب رکھ سکتی ہے

لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ایک قوم یکایک گمنامی سے نکل کر میدان عمل میں آتی ہے۔ طاقت اور ثروت کو غلام بنا کر دنیا پر چھا جاتی ہے پھر یکایک کارزارِ حیات میں وہ پسپا ہونا شروع ہوتی ہے۔اس کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔اس کی دھاک دلوں سے اٹھنے لگتی ہے۔اور تاریخ کے وہی اوراق جنھوں نے کبھی اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ اس کا مدفن بھی بنتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سی طاقت ایسی ہے جو ایک قوم کو مادی وسائل کے صحیح طور پر استعمال کرنے پر ابھارتی ہے اور جس کے ختم ہوتے ہی یہی مادی اسباب اس کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ یہ قوت اخلاق کی قوت ہے۔اس بات کو جسم اور روح پر قیاس کر لیجئے۔قوموں کی زندگی میں مال و اسباب جسم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اخلاقی قوت بمنزلہ روح کے ہوتی ہے۔کوئی صاحب عقل جسم کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔مگر اصل چیز جو اس جسم کو جان عطا کر کے اسے سرگرم عمل رکھتی ہے وہ انسان کی روح ہے۔روح کا جسم سے رشتہ منقطع ہوتے ہی جسم بیکار ہو جاتا ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اس سے بدبو آنے لگتی ہے۔یہی حال قوموں کا ہے۔ان کی زندگی میں مادی ذرائع اور وسائل کافی اہمیت رکھتے ہیں۔مگر ان کی حیثیت ہے بہرحال ذرائع ہی کی۔ اصل قوت جو اِن ذرائع کو استعمال میں لاتی ہے۔ وہ اخلاقی قوت ہے۔اور اگر یہ قوت ناپید ہو تو یہی مادی اسباب اکثر اوقات اس کی تباہی کا باعث

بنتے ہیں۔

اخلاق کی اس قوت کو دو حصّوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک بنیادی انسانی اخلاقیات اور دوسرے اسلامی اخلاقیات۔ بنیادی انسانی اخلاق سے ہماری مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لئے بہرحال شرط لازم ہیں۔ خواہ وہ صحیح مقصد کے لئے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لئے۔ ان اخلاقیات میں اس امر کی کوئی تخصیص نہیں کہ افراد یا قومیں خداوند تعالےٰ کو مانتی ہیں یا نہیں۔ اُن کا آخرت پر ایمان ہے یا نہیں۔ وہ وحی پر یقین رکھتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ان اخلاقیات کو اپنا لیتی ہیں تو وہ زندگی کی اس تگ و دو میں بہرحال کامیاب ہونگی یہاں اس بات کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے عزائم اچھے ہیں یا بُرے۔ اُن کے ہاں طہارت نفس اور رنیت خیر کی متاع ہے یا نہیں جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر ان اوصاف کو پیدا کرے گا وہ دنیا میں یقیناً کامیاب ہوگا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہوں گے۔

"اسلامی اخلاقیات، بنیادی انسانی اخلاقیات سے کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔" اسلام کا پہلا کام یہی ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز اور محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔

اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں جو خیر بھی ہوسکتی ہیں اور شر بھی۔ ان کا کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو۔ اور اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت صرف اسلام ہی انجام دے سکتا ہے۔[1]

لہٰذا ایک فرد یا گروہ کی حقیقی سربلندی تو یہی ہے کہ وہ دین حق کا پورے شعور کے ساتھ پیرو ہو۔ وہ سوچ سمجھ کر ہادیٔ برحق صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان لائے اور اس پر عمل بھی کرے۔ اس لئے جب ہم بنیادی انسانی اخلاقیات کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُن سے ہمارا مقصد صرف اُن قدروں کا تعین ہے جو صرف اس دُنیا میں اِنسان کو سربلندی عطا کرتی ہیں۔ باقی رہی آخرت کی نجات وہ تو صرف قبولِ اسلام ہی میں ہے۔

یہ اِنسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں کہ انھیں کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ انسانیت کی جانی پہچانی متاع ہے جس کا شعور اس کی فطرت میں شروع ہی سے ودلیت کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی قوم کے چند نفوس کا ان اخلاقی بنیادی صفات کو اپنا لینا اس کو ترقی کی راہ پر نہیں لے جاسکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے زیادہ سے زیادہ افراد میں یہ صفات

---

[1] ماخوذ از تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں۔

پائی جائیں۔ یوں تو دنیا کی شاید ہی کوئی قوم ایسی ہوگی جس کے چند افراد میں بھی یہ صفات نہ ملتی ہوں۔ مگر عظمت اور سربلندی صرف اس کو نصیب ہوتی ہے جس کی عظیم اکثریت ان سے متصف ہو۔ آئیے اب ہم اُن صفات کا جائزہ لیں جن کو جب کوئی قوم اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے تو کامیاب ہو جاتی ہے۔

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور نصب العین کا عشق ہی وہ اصلی قوت ہے جو اقوام کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقصد کی مقناطیسی کشش ہی اس کی جد و جہد کا اصلی محرک ہے۔ مقصد سے وابستگی زندگی ہے اور اس سے بے رغبتی موت۔ نصب العین کا عشق ہی ایک ایسا عشق ہے جو جماعتوں اور افراد کی خفتہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ ان کے مختلف اجزا کو باہم جوڑتا ہے اور پھر ان میں ترتیب اور تنظیم پیدا کرتا ہے۔ آپ جہاں بھی دیکھیں گے یہی پائیں گے کہ مقصد اور نصب العین کی محبت نے ہی اقوام و ملل کو سرگرم عمل کیا دنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی دیکھنے میں نہیں آئی جو زندہ بھی ہو اور نصب العین کی محبت سے خالی ہو۔ جس قوم کے افراد اس صفت سے خالی ہوں گے ان کا ترقی کرنا تو ایک طرف زندہ رہنا بھی محال ہے جس جماعت کے ہاں کسی منزل المقصود تک پہنچنے کی تڑپ نہ ہو الغیرہ ... سے لوگ بڑی ہی آسانی سے اپنی اغراض و مفادات کا تابع بنا لیتے ہیں جب ... سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ایک قوم ان اصولوں کی خاطر جنہیں وہ اپنا

سمجھتی ہے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کرے۔ اور یہ جذبۂ ایثار اسی نسبت سے بڑھتا ہے جس نسبت سے نصب العین کے ساتھ اس کے عشق میں ترقی ہوتی ہے۔ پھر اس قوم کی تمام کوششیں ایک قطب نما سوئی کی طرح نہایت ہی فطری انداز میں اسی ایک مقصد کے گرد گردش کرنے لگتی ہیں، دورنگی اور تذبذب انفرادی زندگی میں بھی مہلک امراض ہیں۔ مگر اجتماعی زندگی میں ان کی تباہ کاریاں بالکل ناقابل بیان ہیں۔ زندہ قومیں کسی آئیڈیل کو اپنانے پر اس کی روح کو اپنے پورے جسم میں متحرک کرلیتی ہیں پھر ان کی زندگی کا کوئی مخفی سے مخفی گوشہ، قلب و دماغ کا کوئی ادنےٰ ریشہ بھی ایسا نہیں رہتا جو اس کے اثر سے محفوظ ہو۔ اس کے برعکس ایک دم توڑتی ہوئی قوم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کے لئے زندہ رہنے کا سبق بھول جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے لئے کسی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ دورِ جدید کی مغربی اقوام نے چند خلاف فطرت اور خلاف عقل مقاصد کو اپنا کر دنیا میں ترقی حاصل کی۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ اگرچہ ان کے مقاصد بالکل باطل ہیں، مگر ان کی طلب صادق ہے اور ان کے عزائم راسخ۔ وہ زندگی کے تمام مسائل کو اپنے نصب العین کی روشنی میں دیکھتی ہیں اور پھر اسی کے مطابق ہی انھیں حل کرتی ہیں۔

نصب العین سے محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قوم میں قوت عمل بڑھتی ہے اس میں زندگی کے بھید کھلنا شروع ہوتے ہیں ذہن اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کرکے جسم

کو ارادہ اور احساس کے سہارے آگے بڑھا لے جاتا ہے اور نئے نئے تجربوں سے زندگی میں توسیع و استحکام پیدا کرتا ہے۔ قومیں اپنی تعمیر پیہم عمل سے ہی کرتی ہیں۔ اور یہ عمل ہی کا کرشمہ ہے کہ قوم کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عزم اور حوصلے سے، صبر سے اور استقلال سے، حکمت اور شجاعت سے کام لینا سیکھتی ہے۔ پھر اس میں حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ایسی بلند صفات ابھرتی ہیں۔ نصب العین کا عشق اس کے افراد کو ذاتی اغراض و منافع کی پرستش سے بلند کر دیتا ہے اور ان میں یہ احساس زندہ کرتا ہے کہ ان کا شخصی مفاد دوسروں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس احساس کا ناگزیر اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر شریفانہ خصائل ترقی کرتے ہیں۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم ہمدردی، انصاف، وسعت قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی پاس عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔ ان صفات پر اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری خوبیاں دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے نفس کو زیر کر کے دوسرے کے رنج و راحت کو اپنی ذاتی آسائش اور آرام پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ اور محض "گلیم خویش" کو بچا لے جانے کی فکر میں نہیں رہتا۔ بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لئے جد و جہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ یہ سب خوبیاں کسی بلند نصب العین کا عشق ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک نے اچھے اور برے اعمال کو پانی اور جھاگ سے تعبیر کیا ہے

ایک وہ جو نافع ہیں اور دوسرے ضائع ہونے والے :۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳ : ۱۷)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا، پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے اور ایسے ہی جھاگ ان چیزوں پر بھی اٹھتے ہیں جنھیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کیلئے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اس مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اُڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے ان آیات میں کنایتہً یہ بتا دیا ہے کہ وہی قومیں دنیا میں باقی رہتی ہیں جن کے اعمال سے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے۔ اور جن کا وجود نفعِ خلائق کا موجب ہو۔ ایسی اقوام ہی ہو سکتی ہیں جن کے دل میں انسانیت کا احترام دوسروں کی نسبت زیادہ ہو۔ جن کے دل کے تار اس قدر حساس ہوں کہ نوعِ انسانی کا معمولی دکھ درد بھی ان کے اندر ارتعاش پیدا کر دے۔ جن کے ہاں ایثار اور بےنفسی کی نعمت پائی جائے جس قوم کے افراد ذاتی منفعت اور گھٹیا قسم کی خواہشات کیلئے جیتے ہوں ان سے انسانیت کی فلاح و بہبود کی توقع رکھنا انتہائی غیر دانشمندی ہے

قرآن کا نظریۂ فضیلت یہیں سکھاتا ہے کہ افراد و اقوام کا ایک دوسرے پر تفوق استحصال اور ظلم کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے تاکہ برتر اور فائق لوگ کمتر اور کمزوروں کی خدمت کریں اور اس طرح انھیں بھی اپنی سطح تک بلند کریں۔ ظالم اور عیش پرست افراد یا جماعتیں اپنے ذاتی عیش کی خاطر کمزوروں کو لوٹتی ہیں اور اس طرح انسانیت کی سطح بلند کرنے کی بجائے وہ اسے تنزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ قدرت اُن کے وجود کو کچھ دیر کے لئے برداشت تو کرتی ہے تاکہ انھیں اصلاح کا موقع دے مگر جب وہ اپنی اس روش سے باز نہیں آتیں تو انھیں دنیا میں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ۔

ہم کسی آبادی (قوم) کو ہلاک نہیں کرتے بجز اس کے کہ اس کے افراد ظالم ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان قوموں کو دنیا کی کون کون سی چیزیں ظالم بناتی ہیں

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (۳: ۲)

لوگوں کے لئے زینت رکھی گئی ہے عورتوں بیٹیوں، اور چاندی سونے کے اکٹھے کئے ہوئے ڈھیروں اور نشان کئے ہوئے گھوڑوں چوپایوں اور کھیتوں کی محبت میں یہ تو دنیوی زندگی کی متاع ہے اور اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے۔

قرآن حکیم کے انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ فساد کی اصل جڑ انسان کی یہ تملیکی

ذہنیت (ACQUISITIVE MENTALITY) ہے جو اسے شہوت رانی، لذت طلبی، عیش پرستی، حصولِ دولت اور زینت و تفاخر کے اسباب جمع کرنے میں مشغول رکھتی ہے اور اس کے اندر اس احساس کو فنا کر دیتی ہے کہ وہ ابنائے نوع کے لئے بھی کوشش کرے۔ یہ خود غرضی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے مثلاً معاشی استحصال میں، بے حیائی اور بے غیرتی میں اور کام و دہن کی لذت میں، یہ بیماری نہ صرف چند لوگوں کی ذہنیت اور اخلاق کو بگاڑتی ہے۔ بلکہ قوم کے دیگر افراد بھی اس سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور انحطاط کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ پوری قوم کے اندر "احساس زیاں" بالکل ختم ہو جاتا ہے قرآن حکیم نے مختلف اقوام کی تباہی کا ذکر جس طریقہ سے کیا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ بربادی کا اصل سبب احساس کا فقدان تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنتِ الٰہی میں مبتلا اس وقت کیا گیا جب کہ اُن کے ہاں اخلاقی پستی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اُن کے بڑے بڑے نیک آدمی بھی امراء کے اعمال بد پر گرفت نہ کرتے تھے۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا يُّسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ	تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حدود الٰہی سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ کیسی بُری حرکتیں تھیں جو وہ کرتے تھے کیوں نہ اُن کے مشائخ اور علماء نے ان کو بُری باتیں

الْإِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (المائدہ۔۹)	کہنے اور حرام کے مال کھانے سے منع کیا یہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔
لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵: ۱۱)	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اُن پر داؤد اور عیسٰی بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی۔ اس لئے کہ انھوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن حکیم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا۔

"بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر مگر اس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت کرنے سے نہ روکتا جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایک دوسرے کا اثر پڑ گیا اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داؤد اور عیسٰی بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی"

راوی کہتا ہے کہ جب حضورؐ سلسلہ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آکر اُٹھ بیٹھے اور فرمایا۔

"قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو اور جس کو بُرا فعل کرتے دیکھو اُس کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا اور تم پر بھی اس طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ قوم پر تباہی اس وقت آتی ہے جب پوری کی پوری قوم مفاسد کا شکار ہو جاتی ہے اور اس قوم کے نیک لوگ بھی برائیوں سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے فسق و فجور کے ساتھ مفاہمت کی بڑی وجہ افراد میں تملیکی ذہنیت کا پیدا ہونا ہے

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً	بچو اس فتنہ سے جو صرف انھیں لوگوں کو مبتلائے مصیبت نہ کریگا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا۔
(۸ : ۲۵)	

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالے کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے نہ ٹھہرنے دو کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری کرو گے اور اس کو پھیلنے دو گے تو اللہ کی طرف سے تم پر عذاب نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور بُرے سب آجائیں گے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے :۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل خاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرینھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکرون فاذا فعلوا ذالک عذاب اللہ الخاصۃ والعامۃ۔

اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا۔ مگر جب وہ اپنے سامنے بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں تو اللہ خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔

لہٰذا کسی قوم کی بربادی کی اصل وجہ ذلیل مقاصد کی طلب ہے۔ یہ ذلیل خواہشیں انسان کے اندر تخلیقی قوتوں کو بالکل نیست و نابود کر دیتی ہیں۔ جو لوگ ان کو پورا کرنے کے لئے ہر وقت دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت ہی پست سطح پر آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں سے یہ مقاصد پورے کئے جاتے ہیں ان کی ذہنیت بھی بگڑ جاتی ہے۔ ان کے اندر وہ جرات ایمانی ختم ہو جاتی ہے جس کو کام میں لا کر وہ ان برائیوں کو روک سکیں۔ وہ اپنے اندر تحریص و ترغیب کی یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں پاتے اور اپنے آپ کو فسق و فجور کے اس سیلاب میں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وقت خدا انھیں ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے پکڑ لیتا ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا

اور جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اسکے دولتمندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے

فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔

(بنی اسرائیل۔ ۲)

ہیں اس لئے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے اور اب اس پر ہمارا قانون فطری منطبق ہوجاتاہے اور ہم اس کو تباہ کر دیتے ہیں

علامہ ابن خلدون نے مذکورہ بالا آیت کو اصل قرار دے کر زوال تمدن پر جو جامع اور مفصل فلسفیانہ مضمون لکھا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

جب شہری لوگوں کو دولت و ثروت مل جاتی ہے تو وہ فطرتاً ان کو تمدنی ساز و سامان کی طرف مائل کر دیتی ہے ۔ اس لئے ان کے کھانے پینے رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے کی تمام چیزوں میں رنگینی اور اعجوبگی پیدا ہو جاتی ہے اور جب رنگین مزاجی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے ۔ تو انسان شہوانی خواہشوں کا غلام ہو کر دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کے مصارف میں اضافہ ہوجاتا ہے اور چونکہ سلطنت کے عین شباب کے زمانہ میں تمدن اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ جاتا ہے اور ہر سلطنت میں ٹیکس لگانے کا یہی زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت سلطنت کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور ٹیکس کا تمام تر بار تجارت پر پڑتا ہے کیونکہ تجارت پیشہ لوگ جو کچھ صرف کرتے ہیں اسکو اسباب تجارت ہی سے وصول کرتے ہیں اسلئے ٹیکس اشیاء کی اصل قیمت کا جزو ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متمدن لوگوں کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں

اور ان کی تمام آمدنی انھیں مصارف میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ مفلس اور محتاج ہو جاتے ہیں ۔"

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس مسئلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :۔

" جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انھوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بیجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے ۔ اور قوم کے اکابر اس جد و جہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسباب تعیش میں وہ کس طرح دوسروں پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں ۔ حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ اُن کی کمر کا پٹکا یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا انکے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور

ضرورت سے زائد نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں حشم وخدم اور حسین وجمیل باندیاں موجود ہوں ۔ اور صبح وشام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں ۔ اور جام وسبوے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو ۔ اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مترادف ہے ۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت کی یہ حالت تھی کہ دلوں کا امن وسکون مٹ گیا تھا ۔ ناامیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج وغم اور آلام ومصائب میں گھری نظر آتی تھی اس لئے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی ۔ اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی البتہ اس کے لئے بادشاہ ، نواب ، امراء اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی ۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں تاجروں پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی ۔ اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات وضروریات کے مطابق بھی کچھ نہ کچھ پیدا کر سکیں خلاصہ یہ کہ ظلم وبداخلاقی کی انتہا ہو گئی ۔

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض
ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا
اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا
جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے۔ اور اس کا قلع قمع ہو جائے
... اس نے ایک نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر
بنا کر بھیجا۔ وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی اُن تمام رسوم کو
فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر
ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظریہ کی صداقت کو صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ذہین
انسانوں نے قبول کیا ہے۔ چنانچہ لیبان اپنی شہرہ آفاق کتاب "قوموں کی ترقی
اور تنزل کے قوانین نفسی" میں لکھتا ہے:۔

جب کوئی قوم تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ اور
نفوذ و قوت کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتی ہے اور اس کو ہمسایہ
قوم کے حملے کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ نہایت عیش و طرب کے
ساتھ جو دولت کا لازمی نتیجہ ہے زندگی بسر کرنے لگتی ہے
اس لئے اس کے تمام فوجی محاسن برباد ہو جاتے ہیں۔
تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریات میں
اضافہ ہو جاتا ہے ہر شخص کے دل میں خود غرضی
اپنا قدم جما لیتی ہے اور اس مطمح نظر صرف

یہ ہوتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے ہاتھ آئے اس سے نہایت سرعت کے ساتھ ذاتی فائدہ اٹھائے۔ اس بنا پر تمام قوم عام مصالح سے اعراض کرنے لگتی ہے اور قوم کے وہ تمام اخلاقی محاسن فنا ہو جاتے ہیں جو اس کی عظمت کا حقیقی سبب تھے۔ اب اس پر قرب وجوار کی وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہو جاتا ہے۔ روم اور ایران کی سلطنتوں کا یہی حشر ہوا۔ اُن کا نظام حکومت اگرچہ نہایت مستحکم تھا تاہم بربرہ نے روم کا خاتمہ کر دیا اور عربوں نے ایران کے پرخچے اڑا دیئے

دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر پروفیسر آرنلڈ جے ٹائینبی نے بھی اپنی جامع تصنیف "مطالعۂ تاریخ" میں اسی نظریے کی کسی حد تک تائید کی ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ "کسی تہذیب کی نشوونما کا عام طور پر معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ انسانی ماحول پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کر لے یا طبعی ماحول کو اپنے قابو میں لے آئے پہلی صورت میں پڑوس میں رہنے والی اقوام کو فتح کیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں مادی اسباب و ذرائع میں ترقی ہوتی ہے" پھر اس نے نہایت ہی واضح مثالوں سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ نہ تو فوجی تنظیم اور نہ سلطنت کی حدود کا پھیلاؤ کسی تہذیب کی ترقی کا معیار ہیں۔ فوجی قوت کا بڑھنا بذات خود تنزل کی نشانی ہے۔ اسی طرح پیدائش کے طریقوں میں اصلاح کا بھی کسی تہذیب کی نشوونما سے کوئی خاص رشتہ نہیں دنیا میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب قوموں میں مال و اسباب کی فراوانی ہوئی تو انھیں انحطاط نے آگھیرا۔

اس کے بعد وہ لکھتا ہے :۔

" اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرے دل نے اس حقیقت کو بالکل قبول کر لیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک اُن میں تخلیق کی صلاحیت بر سرِ عمل رہتی ہے۔ اور وہ اپنے جغرافیائی ماحول نقل مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا خیر مقدم جدید اور تخلیقی طریقوں سے کرتے چلے جاتے ہیں۔

" اور جب کسی سوسائٹی میں تخلیقی قوتیں رکھنے والی اقلیت غالب ہو جاتی ہے اور پھر محض قوت کے بل پر اپنے اس وقار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے جس کی درحقیقت وہ اہل نہیں رہتی تو حاکم اقلیت[1] کے اخلاق میں یہ انقلاب عوام کو بغاوت پر ابھارتا ہے

---

[1] فرانس کی شکست کا اصلی سبب یہی اخلاقی انحطاط تھا - ایم۔ بادون (M. Baudin) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" میں نے جنرل ویگان سے کہا تھا کہ فرانس میں صرف مادی اور فوجی وسائل کی کمی نہیں بلکہ روحانی قوت کا بھی فقدان ہے۔ اس ملک میں اخلاقی طاقتوں کو شکست ہو چکی ہے۔ فرانسیسی نوجوانوں کو کسی ایسے عقیدہ کی تعلیم نہیں دی گئی جس کیلئے ان کے دلوں میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ ہو۔ اگر ملک کو بچانا ہے تو تعمیر نو کا کام جلد شروع ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ہر طرف شک و تذبذب اور عقائد کی کمزوری کے آثار دیکھ رہا ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ فرانس کا نظم و نسق ایک نااہل حکمران طبقہ کے ہاتھ میں آگیا ہے۔

میں یہ انقلاب کو بغاوت پر ابھارتا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری قوم یا گروہ مسند اقتدار پر آجاتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس تغیر و تبدل کی اصل وجہ یہ فرمائی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (پ ۲ : ۳۳)

اگر اللہ تعالٰی بعض انسانوں کو دیگر انسانوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲-۶)

اگر اللہ تعالٰی بعض گروہوں کو دیگر گروہوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو دیرد خانقاہ اور مساجد جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے مسمار ہو جائیں

مذکورہ بالا آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اس تغیر کی اصل وجہ یہی ہے کہ خداوند تعالٰی یہ نہیں چاہتے کہ پوری نوعِ انسانی اخلاقی پستیوں کا شکار ہو جائے۔

جب انسانوں کا کوئی گروہ اس کارزارِ حیات میں اخلاقی شکست کھا جاتا ہے تو پھر کوئی فوجی طاقت زیادہ دیر تک اسے دنیا میں سربلند نہیں رکھ سکتی وہ جلد ہی دنیا سے نیست و نابود ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا گروہ وجود میں آتا ہے جنکی اخلاقی بنیادیں زیادہ استوار اور مرکزی اصول زیادہ جان بخش ہوتے ہیں اگر اللہ تعالٰی اس عمل کے ذریعہ سے روحِ حیات کی تجدید نہ کریں اور کسی ایک قوم کو غیر معین عرصہ

تک اختیارات کی باگیں دے دیں خواہ وہ اخلاقی انحطاط کی آخری حد تک ہی کیوں نہ پہنچ گئی ہو تو اس سے معاشرتی زندگی کا امن و سکون بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ اسی وجہ سے جب ایک جماعت کو مسند اقتدار سے ہٹایا جاتا ہے تو اسی وقت ایک دوسری جماعت اس کی جگہ آلیتی ہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا ہے۔

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا

اگر تم لوگ جہاد کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہوئے تو خدا تم کو سخت عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا اور اس کو تم کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے

فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۔

ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انکو ہلاک کر دیا اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۔ (۱۱-۵۷)

اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا میرا رب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو اپنا جانشین بنا دے گا اور تم اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

علامہ ابن خلدون اسی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"جب بانیان سلطنت عیش و طرب میں مصروف ہو جاتے ہیں تو اپنے دوسرے بھائیوں کو غلام بنا لیتے ہیں اور ان کو سلطنت کے کاروبار میں

لگا دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے سلطنت میں کوئی حصہ نہیں پایا ہے چونکہ انھوں نے نازونعم میں زندگی نہیں بسر کی ہے اس لئے وہ نوجوان باقی رہتے ہیں اور جب پہلے لوگ عیش پرستی کی وجہ سے بوڑھے ہوجاتے ہیں تو دوسرے گروہ کی عصبیت تازہ رہتی ہے اسی بنا پر وہ اپنا مرجع امید اس ملک کو بنا لیتے ہیں جس سے وہ روک دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عرب میں جب عاد کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ان کے بھائی ثمود صاحب تخت و تاج ہوئے۔ ثمود کے بعد عمالقہ، عمالقہ کے بعد حمیر، حمیر کے بعد تبابعہ، تبابعہ کے بعد اذوار کا دور دورہ ہوا۔ اس کے بعد مصر کی حکومت قائم ہوئی۔"

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (اور یہ زمانے کے انقلاب ہیں جن کو ہم گردش دیتے رہتے ہیں)

30/05/2016

کتابیات

۱۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؛ حجتہ اللہ البالغہ

۲۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی ؛ تفہیم القرآن

۳۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی ؛ تفہیمات حصہ اول دوم

۴۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی ؛ اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی

۵۔ مولانا ابو الکلام آزاد ؛ ترجمان القرآن حصہ اول و دوم

۶۔ مولانا اشرف علی تھانوی ؛ بیان القرآن

۷۔ جناب محمد مجیب بی اے (آکسن) ؛ تاریخ فلسفہ و سیاسیات

۸۔ جناب مظہر الدین صدیقی ؛ اسلام کا نظریہ تاریخ

۹۔ جناب مظہر الدین صدیقی ؛ ہیگل مارکس اور نظام اسلام

۱۰۔ ابن خلدون ؛ مقدمہ — ترجمہ از عبد الرحمن

۱۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان ؛ روح اقبال

۱۲۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی ؛ مذہب و تمدن

۱۳۔ جناب عبد السلام ندوی ؛ انقلاب امم

۱۴۔ جناب ابو سعید بزمی ؛ تاریخ انقلابات عالم

BIBLIOGRAPHY

1. Adam Brooks: The Law of Civilization & Decay.
2. Arnold Thomas: The Legacy of Islam.
3. Amir Ali Sayyed: The Spirit of Islam.
4. Andre Manrois: Why France Fell.
5. Bartald V. V: The Musalman Culture.
6. Berlin Isaih Karl Marx.
7. Bell Clive: Civilization.
8. Bergson: Creative Evolution.
9. Cowper Powys: The Meaning of Culture.
10. Crew Hunt: The Theory & Practice of Communism.
11. Cole, G. D. H. The Meaning of Markism.
12. Croce Benedatto: Polities & Morals.
13. Croce Benedetto: What is Living & What is Dead of the Philosophy of Hegel.
14. Ducondray: History of Modern Civilization,
15. Eastman Max: Stalin's Russia.
16. Engele: Anti. Dhuring.
17. Federn Karl: The Materia'ist Conception of History.
18. Flint Robert: Historical Philosophy in France.
19. Gray Alexander: The Development of Economic Doctrine.
20. Gibbon: The Rise and Fall of Roman Empire.
21. Hakim Abdul: Islamic Ideology.
22. Hitti Philip: History of Arabs.
23. Hilda D. Oakeley: Hitory and Progress.
24. Isawi Charles: An Arab's Philosophy of History.
25. Iqbal M: The Reconstruction of Religious Thought in Islam.
26. Joad C. E. M. Monern Political Theory.
27. Joad, C. E. M: A Guide to Modern Wickedness

28. Joad, C. E. M: Great Philosophers of the World.
29. Joad, C. E. M: Philiosophy of our Times.
30. Joseph R. Strayer: The Interpretation of History.
31. Khuda Bux. Islamic Civilization.
32. Kidwi, M. H. Women.
33. Laski: The State in Theory & Practice.
34. Lembek: The Growth of Mind in Relation to Culture.
35. Lindsay: Karl Marx's Capital.
36. Mazharuddin: Marxism & Islam.
37. MacIver, R. M. & Charless page: Society.
38. Mann Heinrich; Neitzsche.
39. Mandel Baum: The Problem of Historical Knowledge.
40. Muir Edwin: Essays on Litereture & Poetry (Chapter on Oswald-Spengler only).
41. Mosley. A. C. Text Book of Marxist Philosophy.
42. Marx Karl: Capital.
43. Mannehem Karl: Diagenosis of Our Time.
44. Mathews Shailer: The Spiritual Interpretation of History.
45. Mure, R. G: An Introduction to Hegel.
46. Neitzche: Thus Spoke Zartbushtra.
47. Nordau: Interpretation of History.
48. Paul Tilich: The Interpretation of History.
49. Plato: Republic.
50. Russel Bertrand: The History of Western Philosophy.
51. Russel Bertrand: The New Hopes for the Changing World
52. Russel Bertrand: The Practice and Theory on Bolshevism.
53. Schelegal: The Philosophy of History.
54. Spenglor Oswald: Docline of West (2 Volums).
55. Sorokin: The Crisis of our Age.
56. Schace: Hegel's Philosophy

57. Sayyedian, K. G. Iqbals Educational Philosophy.
58. Stace, W. T: Hegel's Philosophy.
59. Toynbee Arnold: Civilization or Trial.
60. Toynbee Arnold: Study of History.
61. Tara Chand: The Inflnences of Islam on Indian Culture.
62. Teggart, J. Fredsriok: The Process of History.
63. Webb's Sidney & Beatrice: Soviet Communism, a New Civiliztion.
64. Webb Clement: A History of Philosophy.
65. Zaki Ali: Islam in the World.

اسلام کا فلسفۂ تاریخ

تاریخ کے حیاتیاتی اور مادی فلسفوں کی
تشریح و توضیح، انکی فکری لغزشوں کی نشاندہی
اور اسلامی فلسفہ کے ساتھ ان کا تقابل

تالیف

عبدالحمید صدیقی ایم، اے

مکتبہ چراغ راہ کراچی

ل ہرمزجی اسٹریٹ